رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

نگار

قیمت
۸؍

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عہ)
علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲۔ افسانے ۱۹۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ معہ تصویر حضرت نیاز ۲۸۰ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)
علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)
علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں اردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے معہ انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عہ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندی شعراء کے کلام کا انتخاب معہ ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول بہ

"نگار" جنوری ۱۹۳۷ء

(۱) "ڈرامہ اصحاب کہف"۔ یہ ڈرامہ مصری انشاپرداز توفیق الحکیم کی کتاب "اہل الاکہف" سے ماخوذ و مقتبس ہے اور تنہا یہی ایسی چیز ہے جو آپ کے ذوق انشا تمثیل کو آسودہ کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ (۲) اسکر وائلڈ کے خطوط جو اُسنے سارہ (مشہور ایکٹرس) کو لکھے تھے اور جو دنیائے ادب و انشاء میں خاص مرتبہ کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ وائلڈ اپنے طرز انشا و ندرت بیان کے لحاظ سے یورپ میں جس مرتبہ کا شخص شمار ہوتا تھا اُسکا اندازہ آپ ان خطوط سے کر سکتے ہیں (۳) "مسئلہ خلافت و امامت" (آزاد خیال شیعی کے قلم سے) مسئلہ خلافت و امامت لاکھ قدیم و لاینحل سہی پھر بھی اس سلسلہ تحقیق و جستجو میں بعض ایسی باتوں کے نکلنے کا امکان ہے جن سے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو سکے چنانچہ اس سلسلہ کا یہ پانچواں مقالہ ہے اسکے بعض عنوان یہ ہیں:۔ مسئلہ خلافت کے مبادی مقدمات۔ نفس مسئلہ خلافت۔ مسئلہ خلافت کے فروع و جزئیات وغیرہ ——— صفحات ۱۴۴ — قیمت عہ علاوہ محصول

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

معاون:- جلیل اعظمی

جلد ۳۲	فہرست مضامین اپریل سنہ ۳۸ء	شمار ۴

پیامِ محبت (نظم) --- عالی جناب جنرل شاہزادۂ والاشان معظم جاہ بہادر ---------- ۲

ملاحظات ---------- ۴

فلسفہ کیا ہے؟ ---------- محبوب علی ---------- ۹

اُردو غزل میں سچائی ---------- فراق گورکھپوری ---------- ۱۸

سیاسیات یوروپ ---------- ۲۶

ادب اور دنیا کا مستقبل ---------- احتشام رضوی ماہلی ایم-اے ---------- ۳۵

فن خطابت اور اہلِ عرب ---------- جلیل الرحمٰن اعظمی ---------- ۴۰

مکتوبات نیاز ---------- ۵۴

باب الاستفسار ---------- ۶۲

اسلامی ہند ---------- ۱۵۱

نغمۂ کارواں ---------- ۱۷

اصلی برقی قوام (تمباکوئے خوردنی قیمتی فی تولہ ۴ عہ) صرف شیخ خورشید علی پرفیومر نظیر آباد لکھنؤ کے پتہ سے مل سکتا ہے

پیامِ محبت

اثر:۔ عالی جناب شاہزادۂ والاشان معظم جاہ بہادر

یہ ترجیع بند شاہزادۂ والاشان معظم جاہ بہادر کا عطیہ ہے اور اس لحاظ سے کہ نظم مسلسل کی طرف شاہزادۂ محتشم الیہ کا یہ بالکل پہلا اقدام ہے، یقیناً "یادگار جمیل" کی حیثیت رکھتا ہے ۔۔ نظم کا میدان جتنا وسیع ہے اتنا ہی دشوار گزار بھی ہے۔ اس میں انسان کھو بھی جاتا ہے اور ٹھوکریں بھی کھاتا ہے، لیکن شاہزادۂ ممدوح کی اس فکر اولین میں جتنے امکانات ترقی پوشیدہ ہیں انھیں کوئی صاحب نظر نظرانداز نہیں کرسکتا ۔۔ اس پیام محبت میں جسے "پیام مجبوری" یا دا سوخت کہنا زیادہ موزوں ہوگا، شاہزادۂ والاشان نے اپنی والہانہ شیفتگی کی تصویر جس تکمیل حسن کے ساتھ پیش کی ہے وہ یقیناً داد سے مستغنی ہے اور اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میں اپنی حد سے تجاوز کرنے والا قرار دیا جاؤں گا تو یہ ظاہر کرنے میں مجھے مطلق تامل نہ ہوتا کہ اس نظم سے جو بوئے برشتگی آرہی ہے وہ یقیناً کسی داغ تازہ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے ۔۔ محبت کی تڑپ ہر جگہ ایک ہے جو سر پھوڑنے کے لئے سنگ مرمر اور سنگ خارا میں امتیاز کرنے کی فرصت نہیں رکھتی۔ سچ ہے

عشق ہر جامی رود ما را بہ ساماں می برد

شاعری کا وہ عنصر جو اسے الہام و اعجاز کی حد تک پہونچا دیتا ہے صرف عنصر صداقت ہے وہ غزل ہو یا نظم، داستان حسن و عشق ہو یا بیان فلسفہ و حکمت ہر جگہ کامیابی کا راز خلوص جذبات میں پنہاں ہے۔ آنسو ہنسنے میں بھی نکل آتے ہیں اور رونے میں بھی، لیکن ایک جگہ وہ "سیل نشاط" ہیں اور دوسری جگہ "طوفانِ غم" ٹوٹے ہوئے دل کے جذبات پریشان اور دکھے ہوئے جی کی داستان سے لطف اٹھانے کے لئے فلسفہ و منطق نہیں بلکہ صرف دل دردمند درکار ہے اور اگر یہ جنس دنیا سے ناپید نہیں ہوگئی تو کوئی وجہ نہیں کہ شاہزادۂ ممدوح کے ان نشتروں سے جو خون ٹپک رہا ہے وہ کم از کم اس کے دامن کو رنگین نہ بنا دے جو اس نظم کا مخاطب صحیح ہے۔ گو نہ ہمیں اس کے سمجھنے کا حق حاصل ہے نہ اس کی جستجو کا۔

نیاز

اے جذبۂ محبت — ان سے یہ حال کہنا | کہنا کہ میری دنیا — برباد ہو رہی ہے
ان کو اگر خوشی ہو — میرا ملال کہنا | غمگیں خموشیوں میں — فریاد ہو رہی ہے
وہ دیں جواب اگر کچھ — دل کا سوال کہنا | اک تازہ رسمِ اُلفت — ایجاد ہو رہی ہے
اُن کا بیان سُن کر — اپنا خیال کہنا | بیداد کر رہے ہو — بیداد ہو رہی ہے
پھر میرا نام لیکر — میرا سلام کہنا | پھر میرا نام لیکر — میرا سلام کہنا
میرا سلام کہکر — میرا سلام کہکر
میرا پیام کہنا — میرا پیام کہنا

کہنا کہ زندگی میں — کوئی مزا نہیں ہے، | کہنا کہ اب کہاں ہے — وہ آپ کی عنایت
یعنی نظر تمہاری — درد آشنا نہیں ہے | یا آپ وہ نہیں ہیں — یا آگئی قیامت
جب سے بچھڑ گئے ہو — وہ دل رہا نہیں ہے | لب تک نہ آسکے گی — دل میں جو ہے شکایت
میری مصیبتوں کی — کچھ انتہا نہیں ہے | اک حرفِ آرزو ہے — یا درد کی حکایت
پھر میرا نام لیکر — میرا سلام کہنا | پھر میرا نام لیکر — میرا سلام کہنا
میرا سلام کہکر — میرا سلام کہکر
میرا پیام کہنا — میرا پیام کہنا

کہنا کہ یاد کرلو بھولی ہوئی کہانی
گزری تمہاری خاطر کس طرح زندگانی
دل نقشِ آرزو ہے یا درد کی نشانی
قسمت نے تم کو پایا اور کھو گئی جوانی
پھر میرا نام لیکر میرا سلام کہنا،
میرا سلام کہکر
میرا پیام کہنا

کہنا کہ تم نہیں ہو پر یاد آرہے ہو
یہ بھی ہے اک عنایت یوں ظلم ڈھا رہے ہو
میری نظر سے چھپ کر دل میں سما رہے ہو
جس کو بنا چکے تھے اُس کو مٹا رہے ہو
پھر میرا نام لے کر میرا سلام کہنا
میرا سلام کہکر
میرا پیام کہنا

کہنا کہ پھیر لی ہے جب سے نگاہ تم نے
دل لے کے کر دیا ہے دل کو تباہ تم نے
کیوں مجھ سے ترک کر دی وہ رسم و راہ تم نے
مجھ کو نہیں بتایا میرا گناہ تم نے
پھر میرا نام لیکر میرا سلام کہنا
میرا سلام کہکر
میرا پیام کہنا

کہنا کہ اک بلا ہے اب زندگی کسی کی
قایم رہے گی غم سے کب تک خوشی کسی کی
تم بھی سمجھ رہے ہو بے چارگی کسی کی
محسوس کر رہے ہو شاید کمی کسی کی
پھر میرا نام لیکر میرا سلام کہنا
میرا سلام کہکر
میرا پیام کہنا

کہنا کہ ایک بے کس فریاد کر رہا تھا
ناشادیوں سے خوش تھا دل شاد کر رہا تھا
خود اپنی زندگی پر بیداد کر رہا تھا
کچھ بھولنے کی دھن تھی کچھ یاد کر رہا تھا
پھر میرا نام لیکر میرا سلام کہنا
میرا سلام کہکر
میرا پیام کہنا

کہنا کہ جب مقدر سویا ہوا نہیں تھا
میری نظر حسیں تھی سارا جہاں حسیں تھا
انصاف سے بتاؤ یہ رنگ بھی کہیں تھا
غم آج دل شکن ہے کل تک تو دل نشیں تھا
پھر میرا نام لیکر میرا سلام کہنا
میرا سلام کہکر
میرا پیام کہکر

کہنا کہ ہیں نظر میں گزرے ہوئے زمانے
وہ شوق کی کہانی وہ درد کے فسانے
میری شکایتوں پر وہ عذر وہ بہانے
میں نے کہا بہت کچھ افسوس تم نہ مانے
پھر میرا نام لیکر میرا سلام کہنا
میرا سلام کہکر
میرا پیام کہنا

ملاحظات

وفاق اور ریاستیں

ہندوستان کا دستورِ جدید جو اہلِ ہند کی گزشتہ پنجاہ سالہ کاوشوں کا نتیجہ ہے، نظریہ اور نیت کے لحاظ سے خواہ کتنا ہی آسان، قابلِ قبول اور امید افزا کیوں نہ ہو، لیکن جس وقت عملی نقطۂ نظر سے اس پر غور کیا جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت زبردست خارزار ہے جہاں قدم قدم پر دامن اُلجھنے کا اندیشہ ہے۔ یہاں تک کہ وفاق کے تمام عناصر اپنی اپنی جگہ نہایت غیر متیقن اور مشتبہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے ہیں اور ابتک ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس عطیہ کو "کالائے بد" سمجھ کر رد کر دیں یا ایک شدنی "سانحہ" قرار دیکر کسی نہ کسی طرح اس کو اپنے لئے "گوارا" بنانے کی کوشش کریں۔ اس تذبذب کا سب سے بڑا شکار "ریاستوں" کا عنصر ہے درانحالیکہ اُصولاً ان کے لئے دستورِ جدید میں وہ سب کچھ موجود ہے جس سے زیادہ کی توقع دنیا کے اس دورِ اشتراکیت میں ان کو کبھی نہ کرنا چاہئے۔

وفاق حقیقتاً ایک پنچایتی قسم کا نظامِ حکومت ہے جس میں شریک ہونے والے فریق کسی ایک دستور یا قانون پر اتفاق کر کے اجتماعی حیثیت سے اپنے آپ کو چند مقررہ اُصول کا پابند بنا لیتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ ایسے نظامِ حکومت کی ان ملکوں میں بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے جہاں آبادی کی کثرت تمام افراد کو بمشکل کسی ایک مرکز پر مجتمع کر سکتی ہے اور جہاں مختلف زبان و تہذیب اور مختلف مذاہب و روایات رکھنے والی قومیں پائی جاتی ہوں، چونکہ آبادی کے لحاظ سے ہندوستان یک مختصر براعظم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے طول و عرض میں مختلف الخیال قومیں بہ کثرت موجود ہیں اس لئے یہاں کے لئے وفاقی حکومت زیادہ مناسب سمجھی گئی جس کا کامیاب تجربہ اس سے قبل امریکہ، کناڈا اور آسٹریلیا وغیرہ میں ہو چکا ہے[1]

ہندوستان کی مجوزہ وفاقی حکومت دو اہم عناصر پر مشتمل ہے ایک صوبوں کی خود مختار حکومتیں اور دوسرے وہ ریاستیں جہاں کوئی قدیم فرمانروا خاندان عرصہ سے حکمراں چلا آرہا ہے[2] ان دونوں میں رابطۂ اتحاد قایم رکھنے کا فرض حکومت برطانیہ نے اپنے سر لیا ہے اور مرکزی حکومت کو ایک سرپنچ کی حیثیت دیکر ان دو مختلف و متضاد عناصر کو شیر و شکر بنانے کا مشکل فرض

---

[1] اشاعت آیندہ میں ہم تفصیل کے ساتھ بتائیں گے کہ وفاق کی سیاسی و تاریخی حقیقت کیا ہے اور ہندوستان میں اس کا نفاذ کیا معنی رکھتا ہے۔

[2] ہندوستانی ریاستوں کی آزادی اور برطانیہ کی بالادستی کی مفصل داستان کسی آیندہ اشاعت میں سنئے گا

اس کے سپرد کر دیا ہے۔

اب آپ ان عناصر سہ گانہ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی طرف سے غیر مطمئن ہے اور جس طرح اکھاڑے میں آنے سے پہلے دو پہلوانوں کے دل ایک غیر متیقن کیفیت کے ساتھ دھڑکتے رہتے ہیں اسی طرح یہ بھی تردد و اضطراب میں مبتلا ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ نفاذِ وفاق سے پہلے ہی جہاں تک ممکن ہو اپنے اپنے اغراض کی تکمیل کے لئے راستہ کو صاف و ہموار بنالیں

اس مسئلہ میں سب سے بڑی دقت جس نے ابتک معاملہ کو سلجھنے نہیں دیا، اجزاء وفاق کے نقطہ ہائے نظر کا اختلاف ہے ایک طرف صوبوں کی حکومت ہے جو اپنے آپ کو خود مختار، ترقی یافتہ اور آزاد خیال ظاہر کرتی ہے، دوسری طرف ریاستیں ہیں جو شخصی حکومت ہونے کی حیثیت سے بالکل جداگانہ اُصولِ حکمرانی رکھتی ہیں اور جہاں قدیم روایات خاندانی کی عزت و پرستش کو تہذیب و شائستگی کا انتہائی معیار سمجھا جاتا ہے۔ رہا تیسرا فریق یعنی حکومت برطانیہ سو اس کے نزدیک نہ صوبوں کا مفاد کوئی اہمیت رکھتا ہے، نہ ریاستوں کی آزادی کی بقا کوئی معنی ـــ وہ صرف اپنے تجارتی اغراض اور اپنی بین الاقوامی سیاسی اہمیت کو دیکھتی ہے۔ ایک ہاتھ اس کا زمانہ کی نبض پر ہے اور دوسرا حکومت کی مشینری کے لیور پر۔ وہ میٹر کو دیکھتی جاتی ہے اور سوئی کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ لیور کو حرکت دیتی جاتی ہے۔ برطانوی ذہنیت بالکل ایک لچکدار کمانی کی سی ہے کہ جب تک کوئی دباؤ اس پر نہیں ہے وہ پوری قوت کے ساتھ اُبھری رہیگی، لیکن دباؤ پڑتے ہی وہ اتنا ہی دب جائے گی جتنا وزن اس پر ڈالا گیا ہے۔ وہ کھنچنے اور سمٹنے سے نہیں ڈرتی بلکہ ڈرتی ہے صرف اس سے کہ کہیں وہ ٹوٹ نہ جائے، سو آپ حکومت برطانیہ کی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ پھیلنے اور سمٹنے کی منزلوں سے تو وہ بارہا گزری، لیکن "نقطۂ کسر و انکسار" (Breaking point) سے ہمیشہ بچی رہی۔ الغرض برطانیہ کی یہ لچکدار پالیسی اتنی زبردست چیز ہے کہ اس سے تعلق رکھنے والی قوموں کو خود اپنے اوپر بھی اعتماد باقی نہیں رہا، غیروں کا کیا ذکر ہے اور یہی وہ اصل راز ہے جس کو سمجھنے کے بعد ہندوستان گھبرا اُٹھا اور جس طرح دم گھٹنے کے بعد ایک شخص بے اختیار ہاتھ پاؤں چلانے لگتا ہے اسی طرح یہ بھی بے چین ہوگیا

ریاستیں بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں، لیکن چونکہ ان کی رگوں سے یہ خون نہایت آہستہ آہستہ نچوڑا گیا ہے[1] اس لئے ان میں وہ کیفیت اضطراب پیدا نہیں ہوئی جو برطانوی ہند کی آبادی میں نظر آتی ہے مگر اب کہ وفاق کا مسئلہ درپیش ہے اور ریاستوں کو اپنے آیندہ بقاء و تحفظ کے خیال سے برطانیہ کی گزشتہ تاریخ سیاست کی ورق گردانی کرنی پڑی ہے

---

[1] برطانیہ کی اس پالیسی پر بھی ہم آیندہ ایک مستقل مقالہ پیش کریں گے جس میں بتایا جائے گا کہ اس نے کیونکر تمام معاہدات کو پس پشت ڈال کر ریاستوں پر اپنی سیادت قایم کی

ان میں کم ازکم یہ احساس ضرور پیدا ہوگیا ہے کہ ہندوستان کے آیندہ نظام حکومت میں ان کا وجود بھی ایک وزن رکھتا ہے، لیکن یہ بات ابتک ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ اپنے وزن سے انھیں کیا کام لینا چاہئے۔ نیز یہ کہ اگر کسی وقت برطانیہ نے محسوس کرلیا کہ ہندوستان کا سودا اپنے پلڑے کو ہلکا کرنے ہی سے ہوسکتا ہے تو وہ فوراً ریاستوں کے وزن کو علٰحدہ کردیگا اور اسے مطلق پرواہ نہ ہوگی کہ ان کا کیا حشر ہوا — ایسی حالت میں ریاستوں کو کیا کرنا چاہئے اور اس خطرناک مستقبل کی آمد سے قبل ان کی موجودہ پالیسی کیا ہونا چاہئے؟ — اس کو وہ ابتک نہیں سمجھ سکیں، کیونکہ اگر انھوں نے اس کو سمجھ لیا ہوتا تو شرکت وفاق کے لئے سب سے پہلے اور جلد از جلد انھیں کو طیار ہونا چاہئے تھا جس کی وضاحت ہم آیندہ کریں گے

ریاستوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہرچند برطانیہ ان کی امداد کا محتاج ہے، لیکن یہ احتیاج صرف اسی وقت تک قایم رہنے والی ہے، جب تک ملک کا انقلاب اس کو کسی اور پالیسی کی تعیین پر مجبور نہیں کرتا، کیونکہ ہرچند ریاستوں کا رقبہ تقریباً ہندوستان کے پانچویں حصہ کے برابر ہے، لیکن چار بہرحال ایک سے زیادہ وزن رکھتا ہے اور وزنی چیز کے ساتھ ساتھ حکومت برطانیہ کا جھک جانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کے ثبوت میں سب سے بڑی دلیل جو اسوقت پیش کی جاسکتی ہے وہ لارڈ لوتھین کا بیان ہے جو حال ہی میں شایع ہوا ہے۔ یہ وہی لارڈ لوتھین ہیں جو چند دن ہوئے ہندوستان کی سیاسی حالت کا مطالعہ کرنے خود یہاں تشریف لائے تھے اور جن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ آیندہ وفاق کی بساط حکومت پر وہ ایک زبردست مُہرے کی حیثیت اختیار کرنے والے ہیں۔ یہ ہرچند گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۳۵ء کی ترمیم و تنسیخ کو تو ضروری نہیں خیال کرتے لیکن یہ بات انھوں نے اُصولاً تسلیم کرلی ہے کہ کانگرس کے بعض مطالبات اور خصوصیت کے ساتھ وہ جن کا تعلق ریاستوں کے نظام حکومت سے ہے یقیناً توجہ طلب ہیں۔ گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ انھوں نے "شرکت وفاق" کی مقررہ شرائط کی "کمیت" کو تو بدستور قایم رہنے دیا لیکن "کیفیت" میں تبدیلی کو وہ بھی ضروری سمجھتے ہیں اور یہی وہ تغیر ہے جو سب سے زیادہ ریاستوں کو متاثر کرنے والا ہے

پھر قطع نظر اس سے کہ ریاستوں کو لارڈ لوتھین کا یہ مشورہ دینا کہ وہ زیادہ ذمہ دارانہ طرز حکومت قایم کریں بجائے خود صحیح ہے یا غلط یا یہ کہ ریاستوں کو اس پر عمل کرنا چاہئے یا نہیں، دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ اس طرح کے مباحث کیوں پیدا ہورہے ہیں صرف اس لئے کہ ریاستیں شرکت وفاق میں پس وپیش کررہی ہیں اور اگر انھوں نے مزید انتظار کیا تو عجب نہیں ہوا کا رُخ بالکل بدل جائے اور جو مراعات انھیں اسوقت حاصل ہیں وہ بھی ہاتھ سے کھو بیٹھیں، کیونکہ برطانوی ہند کے مطالبات و ضروریات کے مقابلہ میں ریاستی ہند کی رعایت صرف اسی وقت تک حکومت گوارا کرسکتی ہے، جب تک نقطۂ انکسار سامنے نہیں آیا ہے لیکن اگر اس وقت حکومت نے یہ محسوس کرلیا کہ ملک کے عام مطالبات کے مقابلہ میں اسے اپنے اقتدار یا ریاستوں کی خود مختاری میں سے کسی ایک کی قربانی چڑھانا ضروری ہے تو وہ بلا تکلف ریاستوں کی گردن سامنے کردیگی اور خود اپنی جان کو خطرہ میں نہیں ڈالیگی — اس میں کلام نہیں کہ کسی ایسے ملک کی حکومت جس میں مختلف الخیال عناصر شامل ہوں بڑے جھگڑے

کی چیز ہے، لیکن اگر ان میں سے ہر عنصر کسی ایک غرض مشترک پر قایم ہو جائے تو مفاہمت چنداں دشوار نہیں ہوتی مسئلہ زیر بحث میں صورت مفاہمت متعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہر ایک کا زاویۂ نگاہ معلوم کر لیا جائے۔

برطانوی ہند کے باشندے خواہ وہ کانگرس سے تعلق رکھتے ہوں یا مسلم لیگ سے عام طور پر یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ہندوستان پر انگریزی حکومت قایم نہ رہے اور داخلی و خارجی سیاست تمامتر خود اہل ملک کے ہاتھ میں ہو۔ حکومت کہتی تو یہی ہے کہ ملک کا یہ مطالبہ بالکل درست ہے اور جس وقت اہلِ ملک میں اسکی صلاحیت پیدا ہو جائے گی یہ بھی ہو رہے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے اقتدار و تسلط کو کسی طرح ہاتھ سے دینا گوارا نہیں کرتی اور آخری ساعت تک اس کی یہی کوشش رہیگی کہ ہندوستان اسکے مقبوضات سے باہر نہ ہونے پائے۔ رؤسا، یہ چاہتے ہیں کہ انکی خود مختارانہ حیثیت پر کوئی زوال نہ آئے اور حدودِ ریاست کے اندر کسی اور قوت کو کسی قسم کا دخل حاصل نہ ہو — آپ نے دیکھا کہ ان تینوں عناصر کا میلان ایک دوسرے سے کسقدر مختلف ہے، اگر برطانوی ہند کے باشندوں کی خواہش پوری ہو جائے تو ہندوستان میں نہ انگریزوں کا وجود باقی رہ سکتا ہے نہ رئیسوں کا، اگر حکومت کی پنہاں اغراض بار آور ہوں تو اہل ملک غلامی کے حدود سے کبھی باہر نہیں آسکتے اور اگر رؤسا، ہند کی تمنائیں پوری ہو جائیں تو ہندوستان میں کوئی عام دستوری قانون جو ملک کے تمام افراد پر حاوی ہو کبھی نافذ نہیں ہو سکتا گویا صورتِ حال یہ ہے کہ بظاہر مقصودِ سفر تو ایک ہی بتایا جاتا ہے لیکن سفر کرنے والوں کا رُخ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے، ایک کا منہ مشرق کی طرف ہے تو دوسرے کا مغرب کی طرف، کوئی شمال کی طرف دیکھ رہا ہے تو کوئی جنوب کی طرف — یہ ہے منزلِ وفاق کے مسافروں کا حال اور یہ ہے موجودہ سیاسیات ہند کی غیر تیقن کیفیت جسکو ہر فریق دور کہنا چاہتا ہے لیکن کوئی صورت کامیابی کی نظر نہیں آتی — کانگرس یہ تو چاہتی ہے کہ ملک پر سوائے اہل ملک کے کسی اور کا اقتدار قایم نہ رہے، لیکن یہ مقصود حاصل کیونکر ہو؟ یہ بات ابتک اسکی سمجھ میں نہیں آئی۔ انگریز یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ہندوستان پر ان کی گرفت کسی طرح ڈھیلی نہ پڑنے پائے لیکن اس مدعا کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ اس کا فیصلہ وہ ابتک نہیں کر سکے۔ رؤسا، ہند کی یہ تمنا ضرور ہے کہ اگر اب سے ۵۰ سال قبل کی آزادی ان کو دوبارہ حاصل نہیں ہو سکتی تو کم از کم موجودہ اقتدار ہی ان کا قایم رہے، لیکن یہ خواہش پوری کیونکر ہو؟ اس کی کوئی تدبیر ان کے ذہن میں اس وقت تک نہیں آئی

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی کام جو اجتماعی حیثیت رکھتا ہے اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک اس میں شامل ہونے والے تمام افراد ایک حد تک اپنے اغراض کی قربانی پر آمادہ نہ ہوں اور روادارانہ ذہنیت سے کام نہ لیں۔ اگر اُصولاً یہ بات طے پا چکی ہے کہ ہندوستان کا آیندہ دستورِ حکومت وفاقی حیثیت رکھے گا (اور بہ حالاتِ موجودہ یقیناً اس سے بہتر کوئی فیصلہ ممکن بھی نہ تھا) تو پھر اس فکر میں سر کھپانا کہ تجویز وفاق ہی کو درہم برہم کر دیا جائے سخت غیر دانشمندانہ فعل ہے عقل کا اقتضاء صرف یہ ہے کہ اس تجویز کو جلد سے جلد عملی صورت دیدینا چاہئے تاکہ اگر اس کے بعد کسی اور منزل کی طرف قدم اُٹھانا ہے تو اسمیں تاخیر نہ پیدا ہو۔ لیکن صورت یہ ہے کہ ایک طرف کانگرس بھی اس کو ٹھکرا رہی ہے اور دوسری طرف رؤسا، ہند بھی اسکو قہر کی

نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پھر کانگرس اگر مخالفت کر رہی ہے تو ایک حد تک نادرست بھی نہیں کیونکہ وہ اس ترکیب سے بیش از بیش مراعات حاصل کرنا چاہتی ہے اور اس کی یہ تدبیر زیادہ ناکام نہ رہیگی (جیسا کہ لارڈ لوتھین کی آخری تحریر سے ثابت ہوتا ہے) لیکن حیرت تو ریاستوں پر ہے جو شرکتِ وفاق سے احتراز کر رہی ہیں اور یہ نہیں سمجھتیں کہ آخر میں جو بات انکے لئے سب سے زیادہ نقصان رساں ثابت ہوگی وہ ان کی یہی کیفیت احتراز ہے۔ کانگریس کا ایک اہم مقصود یہ بھی ہے کہ ہندوستان سے "رئیس و ریاست" کا عنصر محو کر دیا جائے اس لئے اگر وہ موجودہ شرائط پر شرکتِ وفاق کے لئے آمادہ نہیں تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ حکومت سے اس بات کا مطالبہ کر رہی ہے کہ اگر ریاستوں کو وفاق میں شریک کیا جا رہا ہے تو انکو اور زیادہ پابند و پابستہ کر شریک کیا جائے۔ چنانچہ ریاستوں میں ذمہ دار حکومت (Responsible Govt.) کے قیام اور رائے عامہ کے تحت انتخاب نمایندگانِ وفاق کا مطالبہ اسکا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ لیکن ریاستیں اس خطرہ کی طرف سے بالکل مطمئن ہیں اور سمجھ رہی ہیں کہ وفاق کی مخالفت، کانگرس کی ہمنوائی ہے اور اس طرح وہ گویا برطانوی ہند کی ہمدردی حاصل کر رہی ہیں۔ درانحالیکہ اسکا دوسرا نام اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے، کانگرس کے اصرار و افکار کی زد تو ریاستوں ہی پر پڑ رہی ہے اور یہ بھی انکی ہاں میں ہاں ملا کر گویا اس امر کی توثیق کر رہی ہیں کہ کانگرس کے مطالبات انکے خلاف واقعی حق بجانب ہیں اور حکومت اگر انکو پورا کرے تو انھیں کوئی عذر نہیں ہے ۔ ریاستیں اپنی اندرونی آزادی کی بقاء کے لئے (جسے صحیح معنے میں آزادی کہنا آزادی کی توہین ہے) اسقدر مضطرب ہیں کہ انھیں مطلق ہوش نہیں کہ اس باب میں ان کی حرکات مذبوحی انھیں کتنا نقصان پہونچا رہی ہیں! اور شرکتِ وفاق میں جتنی تاخیر انکی طرف سے ہو رہی ہے اسیقدر انکی آزادی سلب کر لئے جانے کا امکان ہے ۔ ریاستوں کو اسوقت یہ غور نہ کرنا چاہئے کہ وفاق میں شریک ہونے سے انھیں کیا فایدہ پہونچتا ہے (حالانکہ پہونچتا ہے) بلکہ دیکھنا یہ چاہئے کہ عدم شرکت سے انکو کیا نقصان پہونچنے والا ہے۔ یہ زمانہ حقوقِ استبداد حاصل کرنے کا نہیں بلکہ حقوقِ آزادی دینے اور لینے کا ہے۔ اس لئے اگر ریاستوں نے فرصت صرف اس فکر و تردد میں بسر کر دی کہ آیندہ کے لئے وہ قوت بالادست کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنے معاہدوں اور سندوں کی اہمیت پر زیادہ اعتماد کرنے کی صورتیں پیدا کر لیں تو اسکا نتیجہ سوائے اسکے کچھ نہ ہوگا کہ وہ معاہدات کی رہی سہی قیمت بھی گھٹا دیں گے، کیونکہ تمام برطانوی ہند ان کا مخالف ہے اور ولایت کے ذمہ دار اخباروں کا لب و لہجہ بتا رہا ہے کہ حکومت کس طرح آہستہ آہستہ ملک کے تمام مطالبات کے سامنے گردن جھکاتی جا رہی ہے۔

علاوہ اسکے یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ اگر ہندوستان کی تمام ریاستیں اتحاد و اتفاق کے ساتھ وفاق کی شرکت کو نامنظور کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو بھی اس میں کچھ وزن پیدا ہو سکتا ہے، لیکن جبکہ اس کا کوئی امکان نہیں ہے اور سیکڑوں چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایسی ہیں جن کے مفاد کو شرکت وفاق سے کوئی نقصان نہیں پہونچتا اور جن کی شرکت سے وہ تناسب پورا ہو سکتا ہے جو قیام وفاق کے لئے ضروری ہے، تو پھر چند ریاستوں کا اس سے علٰحدہ رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور ان کا یہ احتراز کبھی ان کے لئے مفید نہیں ہو سکتا بلکہ اندیشہ نقصان کا ہے، کیونکہ اس طرح بہت جلد ان کی رعایا میں اضطراب پیدا ہو جائے گا اور ان کی سیادت کو بجائے خارجی قوتوں کے خود اندرونی ہیجان کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور پھر ان کی مدد کرنے کے لئے نہ وفاق کی حکومت طیار ہوگی، نہ دوسرے لائب ملک معظم ہونے کی حیثیت سے دخل دینا پسند کرے گا۔ اب وقت ہے کہ رؤسا اپنی روایات قدیمہ کو بھول جائیں اور نئی دنیا میں نئے عزائم اور نئی تدابیر کے ساتھ قدم رکھیں ۔ یہ ہے معاملہ شخصی اقتدار کا سو وہ بھی قایم رہ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو ملک و اہل ملک کی خدمت کے لئے وقف کر دیں ۔ روما میں اب نیرو اور کالیگولا دوبارہ پیدا نہیں ہو سکتے لیکن مسولینی برابر پیدا ہوتے رہیں گے اور اسی قوت و جبروت کے ساتھ جو جبابرۂ روما کو کسی وقت حاصل تھی

فلسفہ کیا ہے؟

(مسلسل)

بہ لحاظ ترتیب اب نمبر تیسرے اعتراض کا ہے جس کے بموجب ہر وہ شخص جو بیس منٹ تک مسلسل بول سکتا ہے اور صُغریٰ و کبریٰ سے واقفیت رکھتا ہے فلسفی بن بیٹھتا ہے اس قسم کے افراد بہت سے "اپنے فلسفے" پیش کرتے ہیں انکو نہ سائنس سے اُنس ہوتا ہے نہ ادب سے نہ ریاضیات سے نہ تاریخ سے نہ معاشیات سے نہ ہیئت سے نہ حیاتیات سے اور نہ نفسیات سے انھیں انس ہے تو بس فلسفہ سے گویا کائنات من حیث المجموع سے کم کوئی چیز ان کی نظروں میں جنجتی ہی نہیں ۔ یہ اعتراض بھی اپنی جگہ پر کافی وزنی ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس ہو یا ادب، ریاضیات ہو یا تاریخ معاشیات ہو یا ہیئت حیاتیات ہو یا نفسیات سب مہارت، دستگاہ، تربیت، مشق، دقتِ نظر کی طالب ہیں۔ ان موضوعات میں تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے یہ ضرورتیں فلسفہ میں بھی اتنی لابدی ہیں مگر ایک چیز ہے جو فلسفہ میں اور ان موضوعات میں مابہ الامتیاز ہے اور وہ یہ کہ ان صفات کی عدم موجودگی میں جنجیں میں نے اوپر گنایا ہے آپ نہ سائنس کو ہاتھ لگا سکتے ہیں نہ ریاضیات کو لیکن فلسفہ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں پر مابعد الطبیعی عقل آرائی کو خالص یاوہ گوئی سے تمیز کرنا سخت دشوار ہے۔ اکثر و بیشتر واہیات قسم کی باتیں اس خوبی سے مابعد الطبیعی عقل آرائیوں کا نقاب اوڑھ لیتی ہیں کہ اچھی اچھی بصر نگاہیں نقاب کی یہ کی بھونڈی صورتوں کو نہیں دیکھ سکتیں بس یہی واقعہ ہے جو غیر تربیت یافتہ اذہان کو فلسفہ کی طرف لڑھکا دیتا ہے یہ آسانی کسی اور علم میں نہیں

اس کے علاوہ چھ وجوہ اور ہیں جن کا تذکرہ یہاں ضروری ہے:۔

(۱) فلسفہ کا موضوع بے حد وسیع ہے جو شخص دنیا پر مجموعی حیثیت سے نظر کرتا ہو تو بتلایئے کہ کون چیز اس کے موضوع میں داخل نہیں۔ یہ تو ہوئی ایک وجہ

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ فلسفہ میں فلسفی کا بھی عنصر خاصہ ہوتا ہے ہر شخص ہر چیز پر مساوی دھیان نہیں دے سکتا لہذا وہ رد و پسند سے کام لیتا ہے اور اسی رد و پسند کا دار و مدار تمام تر اس کے دل پر ہوتا ہے

یوں کسی فلسفہ کو غلط اور کسی کو صحیح نہیں کہا جا سکتا ہے فلسفہ جزءً صحیح اور جزءً غلط ہے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ فلسفہ ناقابل تصدیق ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں تو اس کی تردید ہوسکتی ہے کیونکہ تجربی تصدیق اس کے قول کو غلط ثابت کرسکتی ہے لیکن اگر وہی شخص یہ کہے کہ دنیا ایک دوزخ ہے یا ہستی کی اصل فلاں ہے تو اس کی تردید نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کے دعوؤں کی تجربی تصدیق محال ہے آپ اسکے دعوؤں کو واہیات کہہ سکتے ہیں مگر ان کے واہیات ہونے کو تشفی بخش طور پر ثابت نہیں کرسکتے

(۴) چوتھی وجہ وجدان کا ملکہ ہے جس نے ہر کس و ناکس کو اس بات کا حق دار بنا دیا ہے کہ وہ اس کا نام لے کر جو اول جلول بکنا چاہے بک دے۔ وجدان ایک قابل قدر ملکہ ہے لیکن اس کے استعمال کا دائرہ اسی نسبت سے مخصوص ہے۔ وہ جملہ ملکات انسانی میں سب سے زیادہ نوخیز ملکہ ہے اور اگر اسے صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو اس سے ایسے انکشافات ہاتھ لگ سکتے ہیں جن تک تحلیلی عقل کی رسائی ناممکن ہے حسن کار کی تخلیقات اور ماہران ریاضیات وسائنس کے انکشافات سب وجدانی چیزیں ہیں لیکن بایں ہمہ وجدان عقل سے جدا نہیں۔ تربیت یافتہ عقل ہی مسلسل استدلال کے ذریعہ نئی باتیں دریافت کرتی ہے یہ نئی باتیں اگرچہ استدلال کا ایک بڑا پشتارہ اپنی پیٹھ پر سنبھالے ہوئے ہوتی ہیں مگر بذات خود عقل کی پیداوار نہیں ہوتیں وہ وجدانی ہوتی ہیں۔

(۵) پانچویں وجہ تحلیل نفسی ہے فرائڈ، یونگ، اور ایڈلر کے نظریات نے ہکسلے اور لارنس کے خیالات پر گہرا اثر ڈالا یہ پانچوں عقل کی توہین، تضعیف اور تحقیر میں بہت پیش پیش ہیں۔ یہ اسے علیم الشعور کا ایک آلہ کار سمجھتے ہیں

اس عقیدہ نے احمقوں کے لئے ایک اچھی منڈی فراہم کی اب ہر کس و ناکس اپنی متاع فاسد کو لئے ہوئے بازار فلسفہ میں دوڑا چلا آرہا ہے روحانیات اور تھیوسوفی وغیرہ کے فلسفے جہالت کے بطن سے تحلیل نفسی اور وجدان کی صلبی اولاد ہیں۔

(۶) چھٹی وجہ یہ ہے کہ فلسفی کے لئے کون باتیں ضروری ہیں اس کا اب تک تصفیہ نہیں ہوا۔ اگر کوئی معمار گھر اچھا نہ بنائے یا اگر کوئی مصور تصویر اچھی نہ کھینچے یا اگر کوئی کیمیاداں عناصر کی تعداد، ترتیب، اور جوہری اوزان سے واقف نہ ہو تو آپ اس کے جہل کا پردہ فوراً چاک کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی فلسفی صحت فکر اور اصابت رائے کا حامل نہ ہو تو اس بات کا پتہ چلایا نہیں جاسکتا۔ اور پھر اگر غلطی سے اسے زبان و بیان پر کافی دسترس حاصل ہو تو اس کے لئے پیروؤں کی ایک جماعت کا پیدا کرلینا کچھ مشکل نہیں

تاہم میرے خیال میں فلسفی کے لئے ذیل کی دس باتیں ضروری ہیں اور ان کے بغیر کم از کم میرے نزدیک کوئی فلسفی اچھا فلسفی نہیں بن سکتا

(۱) پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ فلسفی کو عہد گزشتہ کے افکار کا مکمل علم حاصل ہو اس سے ہوگا یہ کہ اگلوں نے کیا غلطیاں کیں یہ معلوم ہوجائے گا اس سے فایدہ یہ متصور ہے کہ ان غلطیوں کا اعادہ پھر سے نہیں ہوگا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوجائیگا کہ

مسلمہ عالم فلسفیانہ نتائج کیا ہیں اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ ان نتائج کے اخذ و استنباط میں کافی وقت صرف نہ ہوگا۔ اور تیسری بات جو اتنی ہی اہم ہے یہ ہے کہ بڑے بڑے فلسفیوں کے انتقادی اسالیب کا مطالعہ خود مطالعہ کرنے والے کے اپنے فکر میں ایک انتقادی شان پیدا کر دے گا

(۲) دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ فلسفی تہذیب یافتہ و تربیت یافتہ ہو تہذیب کا تعلق افراد سے نہیں نسل سے ہی لہذا اس میں وہ کمالات بھی داخل ہیں جو کسی نسل نے گزشتہ زمانہ میں حاصل کئے۔ یوں نسلی روایات جن امور پر مبنی ہوتی ہیں ان کی دل سے قدر کرنا بھی فلسفی کے لئے ضروری ہے ان چیزوں کے ملنے سے فلسفی میں ایک ایسی بات پیدا ہو جاتی ہے جو اسے حماقت کے اشتہار سے روکتی ہے اور جنس فضول کو بازار میں آنے نہیں دیتی۔

(۳) تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ فلسفی میں مربوط اور مسلسل فکر کی استعداد ہو فلسفی کے لئے استدلال نہایت ضروری ہے۔ لیکن استدلال دعویٰ کے مساوی نہیں وہ دعویٰ کی تائید میں دلائل پیش کرنے کے مترادف ہے۔

مربوط اور مسلسل فکر کی یہ استعداد بڑی حد تک اکتسابی ہے۔ دماغ اس میں شک نہیں کہ ایک عطیۂ فطرت ہے مگر کوئی دماغ کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو اسی وقت تک صحیح اور بہتر طور پر فکر نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ خاص طور پر تربیت نہ پائے شخصی اپج پر دوسروں کے علم کا بوجھ لادنا بے شک بعض حلقوں میں ظلم کے ہم معنی ہے لیکن یہ بھی تو ظلم ہے کہ شخصی فکر کے آلہ کو تربیت کے سوہن سے تیز نہ کیا جائے

(۴) چوتھی ضروری چیز یہ ہے کہ فلسفی اپنے مطالب کو وضاحت اور صفائی کے ساتھ بیان کرے۔ یہ ضرورت شدید ہے۔ فلسفہ بہ لحاظ اپنی ماہیت کے ایک مشکل اور دقیق موضوع ہے لہذا ضرورت ہے کہ اس کے بیان میں شگفتگی اور صفائی پیدا کی جائے۔ فلسفی کو قابل فہم بننا چاہئے اسے بیان و زبان پر قدرت حاصل کرنی چاہئے۔ اسے مختصر اور قابل فہم الفاظ استعمال کرنے چاہئیں۔ اور اپنے مطلب کو تمثیلات اور استعارات کے ذریعہ مرغوب اور دلچسپ بنانا چاہئے۔ یہ چیزیں فلسفہ کو شاعری سے قریب کر دیتی ہیں۔ فلاطون، بیکن، ہیوم، شوپن ہائر، برٹلے، برگساں، ولیم جیمز، رسل، الیگزینڈر وغیرہ کی تحریروں کا مطالعہ کسی طرح کسی اول درجہ کے ادیب کی تحریروں کے مطالعہ سے کم لذت انگیز نہیں لیکن بیشتر فلسفی اس بات کی پروا نہیں کرتے۔

(۵) پانچویں ضروری چیز یہ ہے کہ فلسفیانہ صداقت معلوم کرنے کی خواہش دل میں موجزن ہو۔ اس خواہش کی راہ میں ان گنت روڑے حائل ہیں مگر ایک سچے فلسفی کی شان یہ ہے کہ وہ ان سب پر غلبہ پائے

(۶) چھٹی ضروری چیز یہ ہے کہ فلسفی کی بصیرت (یا وجدان) قوی ہو۔ اس سے حقائق مجرد کا علم ہوتا ہے لیکن واضح رہے کہ بصیرت اور چیز ہے اور نری تخیل یا ذہنی عادات اور چیز ہیں

(۷) ساتویں ضروری چیز یہ ہے کہ فلسفی امکانات کو رد نہیں کرے

(۸) آٹھویں ضروری چیز یہ ہے کہ فلسفی متعصب نہ ہو۔ تعصب حق اور علم کی طلب کو کم کر دیتا ہے۔ پھر متعصب شخص اپنے خلاف کوئی بات سننی نہیں چاہتا وہ اپنی ذات اور اپنے عقاید کی تنقیدوں پر غور نہیں کرتا وہ انھیں ہیچ سمجھتا ہے اور یہ سچے فلسفی کی شان نہیں۔ سچا فلسفی اپنی تنقیدات سے گھبراتا نہیں۔ وہ ان پر ہمدردانہ غور کرتا ہے۔ وہ اگر صحیح ہیں تو ان کو تسلیم کرتا ہے اور غلط ہیں تو ان کے جواب دیتا ہے۔ فلسفی دوسروں کی مشکلات، دوسروں کے نظریات، سے اسی وقت ہمدردی رکھ سکتا ہے جب کہ وہ غیر متعصب ہو۔

(۹) نویں ضروری چیز یہ ہے کہ فلسفی متکبر نہ ہو اور نہ سست ہو۔ سستی سے عقلی تحقیق کی مشقت بارِ گراں معلوم ہوتی ہے کاوش اور کوشش کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ حاصل شدہ چیزیں بہت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ غرور کی وجہ سے اہم ترین واقعات معمولی واقعات بن جاتے ہیں حالانکہ کوئی واقعہ معمولی نہیں ہوتا۔

(۱۰) دسویں اور آخری ضروری چیز یہ ہے کہ فلسفی شک پسند ہو لیکن شک مقصود نہ ہو بلکہ صرف ذریعہ۔ اس سے انتقاد کی صلاحیت انسان میں پیدا ہوتی ہے اور انتقاد فلسفہ کا مایۂ ناز خاصہ ہے

آخری اعتراض یہ ہے کہ فلسفہ سے ہم کو تنازع للبقا میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ آج ساری دنیا کو ضرورت اسکی ہے کہ کھانے کے لئے دو روٹیاں اور پہننے کو چار گز کپڑا ملے اور فلسفہ نہ روٹی کا سوال حل کرتا ہے اور نہ کپڑے کا۔

یہ اعتراض بھی کافی اہم ہے۔

لیکن ممکن دفاع اس کا یہ ہے کہ دنیا میں صرف دو روٹیاں اور چار گز کپڑا ہی سب کچھ نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی فراہمی پہلے ضروری ہے لیکن ان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کو مدنیت کی تعلیم دی جائے۔

مفید تعلیم کا رجحان آج دنیا میں عام ہے۔ ٹائمس لندن کے ایک نامہ نگار نے آج سے سات آٹھ سال پہلے اخبار مذکور کے تعلیمی ضمیمہ میں اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مفید تعلیم کا بڑھتا ہوا رجحان خوش آیند ضرور ہے مگر ایک اہم خطرہ بھی اپنے میں پوشیدہ رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ یہ تعلیم تعلیمیافتہ طبقے میں پیوپاریانہ ذہنیت پیدا کردے گی لوگ ہر چیز کو خواہ وہ جسمانی ہو یا روحانی تولوں ماشوں میں ناپنے کے عادی ہو جائیں گے۔ تہذیب و تمدن سے بیگانگی پیدا ہوگی اور ان نسلی ورثوں کو جن پر اقوام ناز کرتی ہیں سخت دھکہ پہونچے گا

اور یہ خیال اس کا بالکل صحیح ہے

آج ہمارے ملک میں افلاس اور بے روزگاری کی وجہ سے مروجہ نصاب تعلیم کی فرسودگی کے خلاف سخت احتجاج برپا ہیں۔ لیکن ان بعض دیگر وجوہ سے قطع نظر بھی کرلی جائے جو اس افلاس اور بے روزگاری کے اصلی اسباب ہیں تو بھی مفید اور فنی یا صنعتی تعلیم کا پرچار زیادہ سے زیادہ ہونے کی ضرورت ہے تاہم دو باتیں نظر انداز نہیں ہونی چاہئیں ایک تو یہ کہ تعلیمی اداروں کو صنعتی اسکولوں میں نہ بدلا جائے اور دوسری یہ کہ مفید تعلیم کی

تعریف سے فلسفہ خارج نہیں۔ آپ درسگاہوں کو سیونگس بنکیں فرض کر سکتے ہیں لیکن آپ اگر اصل زر و سود کا مطالبہ صرف نقدی کی صورت میں کریں تو آپ غلطی پر ہوں گے

مفید تعلیم کی اس بحث کے سلسلہ میں اگر میں ڈاکٹر گرمنول پرائر کے ان خیالات کو یہاں پر پیش کر دوں جو موصوف نے جاپان کی حالیہ تعلیمی کانفرنس میں ظاہر فرمائے ہیں تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔

ڈاکٹر پرائر نے کہا کہ "اس جدید تعلیم کا ایک لازمی جز جس پر زور دیا جا رہا ہے یہ ہے کہ طلبا کو شخصی زندگی کے لئے بہتر طور پر تیار کیا جائے ایسے لوگ بہت ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ زندگی کے لئے تیاری حصول معاش کے لئے طلبا، کو تیار کرنے کے مترادف ہے -----

"یہ سچ ہے کہ طالب علم کو کسب معاش کے لئے تیار کرنا بھی تعلیم کا مقصد ہے مگر صرف کسی ایک متعین پیشہ یا فن کی تعلیم ہی زندگی نہیں کہی جا سکتی ---- زندگی کے لئے تیاری کا مفہوم محض کسی فن یا پیشہ کی تعلیم سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ سماج کی زندگی کے لئے طالب علم کی شخصی حیثیت اور ذہنی حالت کو تربیت دینا بھی زندگی کے لئے نئی نسلوں کی تیاری کے مفہوم میں شامل ہے

"تعلیم کا مسئلہ زیادہ تر طلبا کی ایسی تربیت کا مسئلہ ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ پرامن زندگی بسر کرنا سیکھیں"

یوں ڈاکٹر پرائر کی رائے میں تعلیم کا مقصد طلبا کے لئے صرف روٹی اور کپڑا مہیا کرنا نہیں بلکہ ان میں "حق اور آزادی کی محبت، روزانہ معاملات کے متعلق ایک متوازن فہم عامہ، سماجی ذمہ داری کا احساس، اور دنیائے جدید کے سیاسی اور اقتصادی مسائل سے واقفیت" بھی پیدا کرنا ہے۔ تو اب دیکھنا یہ ہے کہ فلسفہ کی تعلیم ان امور کی تکمیل میں کہاں معاون ہو سکتی ہے۔

فلسفہ اپنے طالبوں میں مفصلہ ذیل خصوصیات جنہیں مختصر طور پر فلسفیانہ طبیعت کہا جاتا ہے پیدا کرتا ہے۔

(۱) قلب و نظر میں وسعت۔ فلسفہ کا مطالعہ ہماری تنگ نظری کو دور کرتا ہے وہ چونکہ دنیا پر مجموعی حیثیت سے نظر کرتا ہے اس لئے فلسفی کی نظر بھی قومی و نسلی حدود کو توڑ ڈالتی ہے۔

(۲) رواداری و خوش فہمی۔ فلسفہ میں چونکہ فلسفی کی شخصیت کا ایک عنصر قابل لحاظ حد تک شامل ہوتا ہے۔ اس لئے ہر فلسفی اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ کسی فلسفی کا فلسفہ نہ کامل سچ ہے اور نہ غلط وہ صحت اور غلطی کا مجموعہ ہوتا ہے اس احساس کی وجہ سے فلسفی اپنے مخالف کی رائے کو بھی اتنی ہی اہم سمجھتا ہے جتنی اہم کہ خود اپنی رائے کو۔

فلسفی اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ ہر قوم ایک دین، ایک عقیدہ، اور ایک سجدہ گاہ کیوں رکھتی ہے۔ لہٰذا دنیا میں جتنی اقوام ہیں اتنے ہی عقاید ہیں اور ایسا ہونا ضروری ہے فلسفی چونکہ اپنے عقیدہ سے گہری وابستگی رکھتا ہے اس لئے اسے مطلق تعجب نہیں ہوتا اگر اور اشخاص بھی اپنے عقیدوں سے ویسی ہی گہری وابستگی رکھیں۔ فلسفی عقاید سے زیادہ اس

وناداری کو پسند کرتا ہے جو ہر شخص کو اپنے معتقدات سے ہوتی ہے وہ وفاداری کا وفادار ہوتا ہے اور یہ عین رواداری ہے
پس جو چیز عالم فکر و نظر میں رواداری کہلاتی ہے وہ عالم عمل میں انصاف اور عالم جذبات میں ہمہ گیر محبت بنجاتی ہے
یوں فلسفہ ایک عالمگیر انسانی برادری پیدا کرتا ہے وہ ہمیں کسی مخصوص خطۂ ارض کا باشندہ نہیں بننے دیتا بلکہ سنسار نواسی بناتا ہے۔

(۳) بے تعصبی و بے غروری۔ غیر متعصب اور بے غرور ہونا فلسفی کے لئے سب سے ضروری چیزیں ہیں وہ عالم فکر میں بھی اتنی ہی پسندیدہ ہیں جتنی کہ عالم عمل میں۔

(۴) سنجیدگی و بے حسی۔ فلسفی رنج و مسرت سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوتا۔ وہ ہر چیز کو اس کی مناسب جگہ دیتا ہے۔

(۵) حق اور آزادی کی محبت

دنیا کے تمام لوگ راستی اور عدل کی راہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کے باہمی تعلقات کی بنیاد بجز طمع کے اور کچھ نہیں ہوتی۔ ان کی تمام حوصلہ مندیوں کا انحصار ایک حماقت آمیز ناپائدار شہرت کے حصول پر ہوتا ہے اب رہا میں تو مجھے بدی سے کوئی سروکار نہیں۔ میری حالت پر کسی کو رشک نہیں کرنا چاہئے۔ میں دربار و سرکار کی عزت کو سخت حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہوں۔ اور اپنا قدم ہرگز سرزمین فارس پر نہ رکھوں گا، تھوڑے پر قناعت کروں گا اور یہاں جس طرح چاہتا ہوں رہتا ہوں۔"

یہ ایک خط ہے جو ایک فلسفی ہرقلیطوس کی طرف سے ایران کے صاحب دبدبہ و جلال شہنشاہ دارا کو لکھا گیا۔

"یاد رکھو جو لوگ حقیقت کی تلاش میں لگے ہیں وہ دراصل موت کی تلاش میں لگے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو موت سے خوف زدہ ہونے کی بجائے الٹا اس کے پیچھے دوڑتے ہیں۔

اگر تم زہد و تقوی کو اپنا شعار زندگی بناؤ صبر و حلم کے زیور سے اپنے آپ کو آراستہ کرو عدل و انصاف کو مدنظر رکھو استقلال و ضبط نفس کے خوگر بنو نفسانی خواہشات سے کنارہ کش رہو تو تم یقیناً آسمانی مسرت کے حقدار ہو ایسی حالت میں موت سے ڈرنا اپنی تمام پاکیزگی نفس کی توہین کرنا ہے۔"

"اپالوڈورس بھی تم تو عورتوں سے بھی زیادہ کم زور دل نکلے میں نے عورتوں کو اس لئے یہاں سے روانہ کر دیا تھا کہ وہ میری رخصت کے وقت شور و غل نہ کریں۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ مردوں کے بھیس میں ایک عورت ابھی باقی ہے اماں تم مرد ہو دل کو مضبوط رکھو اور مجھے خوشی خوشی رخصت کرو۔"

یہ ملفوظات ہیں سقراط کے جو آزادیِ ضمیر، آزادیِ عمل، اور آزادیِ خیال کا ایک زبردست بطل تھا۔

(۶) صحت فکر و اصابت رائے — جس علم میں تیقنات کم ہوں اور ممکنات زیادہ اور جہاں شک و تنقید پر زور دیا جاتا ہو وہاں یہ خصوصیات از خود پیدا ہو جاتی ہیں۔

(۷) حق اور علم کی طلب۔ فلسفہ کے معنی خود دانائی کی محبت کے ہیں۔ لہذا فلسفی سے زیادہ جویائے حق و علم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

(۸) تہذیب نفس و بلند نظری۔ فیثا غورث کہتا ہے "اس دنیا میں جہاں انسانوں کی اکثریت ثروت اور شہرت کی دیوانی ہے بعض ہستیاں ایسی بھی ہیں جو ان دنیوی مکروہات سے دور رہتی ہیں اور جنھوں نے صرف مطالعۂ قدرت اور انکشافِ رازِ ہستی کو اپنا مقصودِ حیات قرار دے لیا ہے اور انہی کو میں فلسفی کہتا ہوں"

فلاطون کہتا ہے "جب اسے (یعنی فلسفی کو) برا بھلا کہا جاتا ہے تو وہ اپنے مخالف کے اخلاق پر کوئی حملہ نہیں کرتا اور نہ اس کے سب و شتم کا جواب ترکی بہ ترکی دیتا ہے ۔۔۔۔۔ جب وہ یہ سنتا ہے کہ فلاں شخص ہزاروں ایکڑ زمین کا مالک ہے تو وہ اس چیز کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ اپنے عالم تخیل میں وہ پوری دنیا پر غور و خوض کرنے کا عادی ہے۔ اور جب وہ کسی کو اپنے روبرو کسی خاندان کی مدح و ستایش کرتے پاتا ہے اور یہ سنتا ہے کہ فلاں ایک شریف شخص ہے کیونکہ ایک متمول خاندان کا چشم و چراغ ہے تو وہ اس معیار شرافت کو پست اور اس نقطۂ نظر کو سطحی خیال کرتا ہے کیونکہ اسے یہ معلوم ہے کہ ہر انسان کے ہزارہا نہیں بلکہ لکھو کھا آبا و اجداد گزر چکے ہیں جن میں کئی فقیر بھی تھے اور امیر بھی۔ شاہ بھی تھے اور گدا بھی، وحشی بھی تھے اور متمدن بھی"۔

(۹) عدل پروری، ضبط نفس، قناعت، جفاکشی، بے خوفی، صاف گوئی، پاک بازی، اعتدال پسندی، حلم، انکسار، سیر چشمی، تواضع، شرافت، خندہ جبینی، فیاضی، اور خلوص۔ یہ وہ صفتیں ہیں جو فلسفیوں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان صفات کی پیدایش کو اگرچہ فلسفیانہ مسائل سے براہ راست کوئی علاقہ نہیں ہوتا تاہم ان کے مطالعہ سے یہ باتیں از خود پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ سب صفتیں ایک شخص میں پیدا نہیں ہو سکتیں کیونکہ فلسفی باوجود تمام باتوں کے انسان ہوتا ہے۔ اور چونکہ انسان ہوتا ہے اس لئے انسانی غلطیوں سے بالکلیہ مبرا نہیں ہوتا۔ تاہم فلسفہ صفات مذکورہ میں سے کچھ نہ کچھ صفتیں ہر طالب فلسفہ میں پیدا ضرور کر دیتا ہے یہ صفتیں زندگی کی اصلی قدریں ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک عمدہ مدنیت کے لئے روٹی اور کپڑے کے اتنی ضروری نہیں۔

پس جنس فلسفہ کی قیمت کا اگر کوئی اندازہ ممکن ہے تو وہ انہی اثرات کے ذریعے سے جو فلسفہ طالبان فلسفہ کی زندگیوں پر مترتب کرتا ہے اور ان اثرات سے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں (رسل)

آپ فیثا غورث، ہرقلیطوس، برمانیدس، انیکساغورث، دیمقراطیس، سقراط، انٹیس تھنیز، دیوجانس، ابی قور، روقیئس، فلاطون، ارسطو، پرہو، ہی پاشیا، فارابی، برونو، ڈی کارٹ، بیکن، اسپنوزا، لاک، برکلے، ہیوم، کانٹ، فشتے، شیلنگ، ہیگل، مل، اسپنسر، ماریک، رسل، آئن سٹائن وغیرہ کے حالات اور واقعات پر نظر ڈالیے تو آپ پر میرے متذکرۂ صدر بیان کی صداقت واضح ہو جائے گی۔

ڈی کارٹ جب سویڈن کی ملکہ کرسٹیانا کے سامنے پیش ہوتا ہے تو جہاز کا ناخدا ملکہ کی جناب میں عرض کرتا ہے "حضور عالیہ! میں جس شخص کو جہاں پناہ کی بارگاہ میں پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں وہ انسان نہیں دیوتا ہے اس نے مجھے بحر و فضا کے متعلق تین ہفتوں میں وہ باتیں بتلائیں جو مجھے ساٹھ سال میں بھی معلوم نہ ہو سکی تھیں۔

برکلے کے متعلق ریڈپری کہتا ہے۔ "برکلے کی ملاقات سے قبل مجھے گمان بھی نہ تھا کہ اسقدر علم کا اجتماع اس قدر انکسار اور معصومیت کے ساتھ بحر و فرشتوں کے کسی بشر میں بھی ہو سکتا ہے"

کانٹ کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ جب اس نے وفات پائی تو ایک چھوٹا سا روشن ابر صاف اور شفاف نیلے آسمان میں سے گزر رہا تھا۔ وہ اتنا چمکدار اور دلکش تھا کہ ایک مجمع اسے دیکھنے کے لئے جمع ہو گیا۔ مجمع میں سے ایک شخص نے کہا "یہ کانٹ کی روح ہے جو آسمان کی طرف اڑی جا رہی ہے" کیا یہ ایک خوبصورت اور موثر خراج تحسین نہیں اس بلند مرتبہ جرمن فلسفی کی جناب میں جو زندگی میں بھی ستاروں کی طرح بلند، پاک، منور نظروں کے سامنے گمرسائی سے دور تھا؟

میں نے عمداً صرف تین فلسفیوں کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ دوسروں کی رائیں انکے باب میں جلد فراہم ہو سکیں ورنہ ہر فلسفی کے متعلق کھوج کرنے پر ایسی ہی خوبصورت رائیں دریافت کیجا سکتی ہیں۔ فرصت شرط ہے۔

تو کیا فلسفہ بقول بیکن ایسی بانجھ عورت ہے جسکے ساتھ زندگی بسر کرنا زندگی خراب کرنے کے مترادف ہو؟

واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ اعلیٰ مدنیت کا مظہر اور امن و سلام کا داعی ہے۔ فلسفہ کے متعلق میں نے اوپر یہ بتلایا ہے کہ وہ ہمیں مختلف سائنسوں کے نتائج کو باہم ملا کر مجموعی حیثیت سے دنیا کے متعلق ایک جامع نظریہ ترتیب دینا سکھاتا ہے اجزائے مختلف کا یہ امتزاج فلسفہ کی بہت بڑی خصوصیت ہے جس طرح وہ مختلف سائنسوں میں ربط پیدا کرنا سکھاتا ہے ویسے ہی مختلف اقوام، افراد، اور ملل میں بھی ربط پیدا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم میں ربط پیدا کر سکنے کی صلاحیت نہیں اور یہ کمزوری تہذیب کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔

آج بر و بحر و فضا کے سینے توپوں کی گڑگڑاہٹ، بندوقوں کی سنسناہٹ جنگی جہازوں اور آبدوزوں کی سرسراہٹ اور ہوائی جہازوں کی بھڑبھڑاہٹ سے دہلے جا رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ ہم میں ربط پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے آج دنیا کی ہر حکومت قیام امن کے نام پر افواج اور اسلحہ کی مد میں لاکھوں کروروں پونڈ سالانہ صرف کر رہی ہے کیا ان ارباب حکومت ان خداوندان بست و کشاد کو یہ سمجھانا نہیں دیتا کہ وہ قوم کی دولت کو خود قوم ہی کے قتل پر صرف کر رہے ہیں؟ کیا ملک و ملت کی حفاظت کی "مقدس امانت" کا لحاظ اسی طرح کیا جاتا ہے؟

آج دنیا کے ہزاروں کارخانے ہوائی جہاز، گیس بم، کلدار توپیں اور اسی قسم کے دوسرے آلات حرب لاکھوں کی تعداد میں تیار کر رہے ہیں کیا ان اسلحہ ساز کمپنیوں کے مالکوں، ناظموں، اور حصہ داروں کو یہ معلوم نہیں کہ انکا پیسہ موت کی تجارت میں صرف ہو رہا ہے اور ان کی دولت کا بالقوہ منبع لنگڑے، لولے، اندھے، مفلوج، بے حس،

بے حرکت، اور معذور اجسام ہیں؟ اور کیا انھیں نہیں معلوم کیا وہ معلوم نہیں کرنا چاہتے کہ ان کے اصل زر کا منافع انسانیت کی نزع و سکرات سے، آہ و کراہ سے حاصل ہو رہا ہے؟ موقع پر یہ مجروح، یہ بیمار، یہ اندھے یہ مفلوج، یہ بیکار اور یہ سب وہ خود بھی ہو سکتے ہیں۔

پھر دنیا کے اخباروں کے مالکوں، مدیروں، اور اداریہ نویسوں کو کیا یہ نظر نہیں آتا کہ قومیت اور وطنیت کی دعوت سے وہ خود اپنی تباہی کا سامان مہیا کر رہے ہیں؟ اور پھر ان وطن اور قوم پرستوں کو جو کم از کم اپنے وطنی اور قومی بھائیوں کے قتل عام کو پسند نہیں کرتے کیا یہ دکھلائی نہیں دیتا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی نسل قطع کر رہے ہیں؟

ان حالات پر نظر کر کے تھوڑا سا فلسفہ ہر انسان کو لازماً سیکھنا چاہئے تاکہ وہ مختلف اجزا میں امتزاج، مختلف عناصر میں تالیف، اور مختلف افراد میں ربط پیدا کرنا اسے سکھا دے اور یوں تہذیب کو موت کے منہ میں گرنے سے بچا لے۔

آج دنیا جنگ عالمگیر کے تصوّر سے لرزہ براندام ہے۔ دنیا کے امن پسند اور نیک نہاد افراد اس کوشش میں ہیں کہ اس مصیبت عظمیٰ کو کسی نہ کسی طرح ٹال جائیں شریر اور بد باطن دماغ اس قسم کے مواقع عمداً پیدا کر رہے ہیں۔ لہٰذا ایسے وقتوں میں کہ دنیا کی نظریں ممالک کی وزارت خارجہ کے دفتروں کی طرف اٹھی ہوئی ہیں تخلیقی اور تحقیقی کام بھی جیسا اور جتنا ہونا چاہئے نہیں ہو سکتا۔ جن مجلسوں میں کل تک طبیعیات اور تحلیل نفسی پر ادب اور حسن کاری پر شعر و شاعری پر مصوری و نقاشی پر شراب و شباب پر موسیقی و سرود پر رائے زنیاں ہوتی تھیں اب وہاں جنگ و جدل پر جمہوریت و آمریت پر رام راج و سام راج پر شعاع موت اور گیس بمب پر گفتگو ہو رہی ہے، چار آدمی ملتے ہیں اور بات چیت عالمگیر جنگ کے امکان پر ہونے لگتی ہے۔

ان حالات میں اول درجہ کی ادبی اور حسن کارانہ تخلیقیں یا تو نا پید ہو جاتی ہیں یا پھر کم ہونے لگتی ہیں کسی خوبصورت چیز کو سوچنے اور پیدا کرنے کے لئے جن جن اُمور کی ضرورت ہے وہ آج یا تو عنقا ہیں یا عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یوروپ میں جوان دنوں آتش فشاں کے دہانہ پر ہے حسن کاری اور ادب رو بزوال ہیں۔

لیکن اگر دنیا والے تخلیقی اور تحقیقی کام انجام نہ بھی دیں تو وہ فلسفہ سے مس پیدا ضرور کر سکتے ہیں۔ سقراط کی حیات آفریں موت کے بعد سے فلسفہ انسانیت کے زخموں کا مرہم بن گیا ہے طمانیت قلب سے محروم ہستیاں اسمیں طمانیت قلب پاتی ہیں بدبخت افراد کو اس میں درس صبر و بے حسی ملتا ہے اور بزدل اشخاص کو وہ جرأت و ہمت دلاتا ہے اسلئے ٹچ اسٹون کی طرح کیا ہمیں آپس میں ہمیشہ یہ نہیں پوچھتے رہنا چاہئے کہ

"اماں تجھ میں کچھ فلسفہ بھی ہے؟"

محبوب علی

اُردو غزل میں سچائی

پروفیسر فراق کی وہ تقریر جو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے ۲۰ فروری کو نشر کی گئی

سچ بولنا آپ سہل سمجھتے ہیں یا مشکل۔ عدالت میں حلف اُٹھاتے وقت گواہ کو وعدہ کرنا پڑتا ہے کہ ہم سچ بولیں گے اور پورا پورا سچ بولیں گے۔ یہ سب سہی لیکن سچ بولنا ہے بڑا مشکل کام۔ اگر میں آپ کا نام پوچھوں تو شاید مجھے بے ضرر سمجھ کر آپ سچ بولیں گے۔ لیکن آپ مجھے اپنا سچا دوست سمجھ کر بھی اپنی شکل کے بارے میں، اپنے چہرے اور بشرے کے بارے میں مجھ سے کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتے جس سے ہو بہو آپ کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آجائے۔ کبھی آپ نے اس امر پر غور کیا کہ جب کوئی چھوٹا بچہ ڈانٹا جاتا ہے تو روتے وقت وہ یہ شکایت کرتا ہے کہ مجھے مارا ہے۔ بچہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ؟ - بات یہ ہے کہ بچہ سچ بولنے کی کوشش کر رہا ہے وہ ڈانٹنے اور مارنے میں فرق جانتا ہے لیکن اس فرق کو الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا اور یہ کہہ کر روتا ہے کہ فلاں نے مجھے مارا ہے۔ پیچیدہ باتوں اور سامنے کی باتوں میں بھی ہم آپ سب بچوں کی طرح اپنے کو اکثر بے بس پاتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہمارا آپ کا "حسن بیان" اکثر ایک گونگے آدمی کے اشارات سے زیادہ نہیں ہوتا۔

ٹھیک یہی حال انسانی قوم اور انسانی تمدن کا ہے، انسانیت اور تمدن کا بھی کبھی بچپن رہا ہے۔ قوم انسانی کی پرانی تاریخ آج بھی ایک بچہ کی زندگی میں اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ ایک بچہ بے جان چیزوں کو جاندار سمجھ کر ان سے کھیلتا ہے ان سے باتیں کرتا ہے۔ آج سے کئی ہزار برس قبل بچے نہیں بلکہ جوان اور بوڑھے بھی، دریا، پہاڑ، آگ، پانی، ہوا، خاک حیوانات و نباتات، آسمان و زمین اور قدرت کے تمام مظاہر کو جاندار سمجھتے تھے اور ہر چیز کی ایک شخصیت مانتے تھے۔ یہیں سے فطری اساطیر (Nature Mythology) کا آغاز ہوا اسی معصوم اور دوشیزہ تخئیل نے دیوی دیوتا فرشتے، دیو، جن اور پری اور کہا جاتا ہے کہ خدا تک کا تصور قایم کیا۔ مذہبی رموز معجزوں اور کشف و کرامات کا سلسلہ شروع ہوا۔ تہذیب ترقی کرتی گئی۔ حقایق و معارف دریافت ہوتے گئے لیکن ان خیال آرائیوں کی بڑی عمر تھی۔ کم از کم جس رنگ و روپ میں یہ خیالات یا واہمے پیدا ہوئے تھے وہ بھیس اتنا حسین جھوٹ تھا کہ اس کا جادو اب بھی دلوں کو موہ لیتا ہے۔

دو کہاوتیں یاد آئیں - ایک انگریزی کی اور ایک فارسی کی - انگریزی کی مثل ہے The wish is father to the thought (یعنی جیسی خواہش ہوتی ہے ویسا ہی خیال بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ شاعری کے ایک بڑے حصے کو (the poetry of wish-fulfilment. یعنی تکمیل خواہش والی شاعری کہا جاتا ہے۔ تلسی داس فرماتے ہیں :-

جاکی رہی بھاونا جیسی ہری مورت دیکھاتن تیسی

فارسی کی کہاوت ہے - جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ - انگریزی میں بھی (Travellers Tales) والا فقرہ مشہور ہے - ملکہ الیزبتھ کے زمانہ میں سیاحوں کے ایسے سفرنامے نکلے جنھیں پڑھئے تو الف لیلا اور طلسم ہوش ربا سے کم نہیں دنیا میں جھوٹ کا بول بالا ہے - ہمیشہ رہے نام اللہ کا - سب سے مزے کی بات تو یہ ہے کہ سائنس اور ریاضی جو سچائی کی ٹھیکیدار سمجھی جاتی ہیں وہاں بھی صورت حال کچھ بہت بہتر نہیں ہے - وہاں بھی بالکل جھوٹ باتیں فرض کرکے سچے اور کارآمد نتیجے نکالے جاتے ہیں - فلسفے کا ایک اسکول (Pragmatism) کہلاتا ہے جس کی رو سے سچ وہ ہے جو کام کرے یا جس سے کام چلے - اس کو انگریزی میں "The philosophy of As if" کہتے ہیں - والٹیر کا قول ہے :- (If there were no God it would be necessary to invent) اگر خدا نہ ہوتا تو اسے ایجاد کرنا پڑتا - اس پر بھی انسان اپنے کو سچا سمجھتا ہے - بے اختیار ایک قصہ یاد آیا - بنارس میں ایک رئیس کا ملازم ان کا پاؤں دبا رہا تھا - ملازم نے کہا سرکار رنگون میں ایسی آندھی آئی کہ رنگون کے آدمی اُڑتے اُڑتے آکر مغل سرائے میں گرے - انھوں نے جھلا کر کہا - ابے یہ کیوں نہیں کہتا کہ بنارس میں گرے - ملازم نے کہا سرکار دو چار میل کے لئے کیا جھوٹ بولیں - میں نے نفسیات کی ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ اگر کسی بچے کی ہتھیلی میں سوئی چبھ جائے تو بچہ درد سے تڑپیگا ضرور مگر یہ نہ بتائے گا کہ اسکی ہتھیلی میں سوئی کہاں چبھی - وہ پوری ہتھیلی دکھائے گا لیکن اس کا شعور اس دکھتے ہوئے نقطہ پر مرکوز نہ ہو سکیگا جہاں سوئی چبھی تھی - اور کبھی کبھی تو سچ بات بھی اتنی مہمل ہوتی ہے کہ معاذ اللہ - ایک سائیس گھوڑا ٹہلا رہا تھا - کسی نے پوچھا یہ گھوڑا کس کا ہے - سائیس نے جواب دیا - ہم جس کے نوکر ہیں - پھر پوچھا - تم کس کے نوکر ہو - اسنے جواب دیا جس کا یہ گھوڑا ہے، سچ ہے "کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست"۔ کوئی رہرو آج تک اس راہ سے بھٹکا نہیں خیر یہ تو مہمل راست گوئی ہوئی - لیکن ذرا واضح اور مفصل راست گوئی کے کرشمے دیکھئے - تلسی داس اور کبیر صاحب نے کہا کہ اے میرے باپ کی بی بی ذرا آگ دے دے اُس نے گالیا دیں، اور تلسی داس نے کہا "متوا ذرا آگ دیدے تو اُس نے بخوشی آگ دیدی" یعنی ذرا بات چھپانے سے کتنا کام چلا - ایک مشہور انگریزی اخبار کے مالک نے ایک شخص کو سانحہ نگار مقرر کیا - شہر کی خبروں کی رپورٹ کرنا اس کا کام تھا - نئے سانحہ نگار نے پوچھا کہ خبر کیا چیز ہے اخبار کے مالک نے بتایا کہ اگر شہر میں کسی آدمی کو کتا کاٹ کھائے تو یہ خبر خبر نہ ہوگی، لیکن اگر کسی کتے کو آدمی کاٹ کھائے تو خبر ہوگی شاید اسی لحاظ سے امیر مینائی نے یہ شعر لکھا تھا :-

نہیں بچتا دل پُرداغ اُسکی زلفِ پیچاں سے یہ وہ ناگن ہے جو طاؤس کو اُڑ اُڑ کے ڈستی ہے

مور سانپ کو کھا جاتا ہے لیکن امیر مینائی کے یہاں مور کو سانپ کھا جاتا ہے۔ مولانا روم کی مثنوی میں ایک گڈریا خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے خدا تو میرے گھر آئے تو میں تجھے سردی نہ لگنے دوں۔ اون کے کمبل تجھے اُڑھاؤں اور بھوک کی تکلیف دور کرنے کے لئے تجھے بھیڑ کا دودھ پلاؤں۔ کہیں حضرت موسیٰ ادھر سے گزر رہے تھے۔ یہ کفر کے کلمات سنکر بُری طرح بگڑ گئے اور خدا کے سردی اور بھوک سے آزاد ہونے کی حقیقت اس طرح ڈانٹ کر اس بھولے بھالے گڈریئے کو سمجھائی کہ بیچارہ ہکا بکا رہ گیا۔ فوراً ندا آئی :۔

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

میں کچھ اپنا حال بھی آپ کو بتا دوں۔ میں جھوٹ بول کر خوش تو نہیں ہوتا لیکن اس آدمی سے ذرا بچتا رہتا ہوں جو صرف سچ بولتا ہے۔ ایسے آدمی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ نہ جانے کب کیا کہہ بیٹھے۔ بہرحال میں ذرا شیخ سعدی شیرازی کا پیرو ہوں۔

ہاں تو شاعری اور سچائی میں کیا تعلق ہے۔ میکالے کا قول ہے تہذیب کی ترقی کے ساتھ شاعری کا زوال قریب قریب لازمی ہے وہ کہتا ہے کہ شاعری کے نقش و نگار ان تصویروں یا پرچھائیوں کی طرح ہیں جنھیں "میجک لینٹرن" بالکل تاریکی میں سیمیں چادر پر منعکس کرتی ہے۔ مکالے کا یہ قول سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی۔ جب انسانیت کا بچپن تھا تو شاعری میں دیوتا۔ پریاں۔ فرشتے۔ شیاطین۔ جادوگری۔ طلسمات اور معجزے دکھائے جاتے تھے۔ تہذیب سائنس اور فلسفہ ترقی کرتے گئے۔ اور یہ سماوی ماورائے فطرت شاعری تنزلی کرتی گئی، پھر شاعری نے دیوی دیوتا کو چھوڑ کر بادشاہوں اُمرا۔ سپہ سالاروں اور سالار قافلوں کو غیر معمولی مردوں اور عورتوں کو ہیرو اور ہیروئن کی شکل میں پیش کیا۔ کردار نگاری اور منظر نگاری میں پُرزور مبالغہ سے کام لیا۔ کیا فردوسی نہیں کہتا کہ رستم ایک معمولی آدمی تھا۔ میں نے رستم کو رستم کیا۔ خیر جب تہذیب کی ترقی کے ساتھ دبے پاؤں جمہوریت بھی آگے بڑھی اور شعور انسانی میں توازن اور قوتِ اظہار میں خود اعتمادی پیدا ہو چلی تو شاعر نے ان افسانوں کو تہہ کیا۔ اب شاعری اصلیت کی طرف مڑی، مانوس۔ متعارف۔ معمولی اور ٹکسالی زندگی کی روداد شاعری کے نغموں میں سنائی دینے لگی۔ اور شاعری میں واقعیت۔ اصلیت اور سچائی (Realism) کا دور شروع ہوا۔ سچ ہے۔ ہر خواب کی تعبیر اسی جانی پہچانی ہوئی دنیا میں ملتی ہے۔

ابتک میں نے جو کچھ کہا وہ شاعری اور سچائی کے عنوان کا محض اک پس منظر ہے۔ اور وہ بھی نامکمل پس منظر۔ آیئے اب اُردو غزل پر نظر ڈالیں، اُردو غزل میں دیو جن، پری، بھوت پریت، سلاطین اور امرار کا گزر نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس قسم کے جھوٹ اور مبالغہ کی جگہ لفظی رعایت، تصنع، اور اُس مبالغہ آمیز مضمون آفرینی نے لے لی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ کوہ کندن اور کاہ برآوردن۔ لیکن یاد رہے کہ بات کو سلیقہ سے گھٹایا بڑھا کے کہنا کبھی کبھی سچائی کی جان ہوتی ہے۔ مثلاً میر کا یہ شعر :۔

دنیا کی سیر میرؔ کی صحبت میں ہو گئی قسمت سے مجھ کو آج یہ بے دست و پا ملا

کہا جاتا ہے کہ اُردو شاعری کے ہر دور میں ایک فطری اور ایک غیر فطری شاعر ہوا ہے۔ میرؔ و سوداؔ۔ غالبؔ و ذوقؔ۔ مصحفیؔ و انشاؔ۔ ناسخؔ و آتشؔ۔ انیسؔ و دبیرؔ۔ داغؔ و امیرؔ۔ اس کے بعد جوڑیاں نہیں ملتیں۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ امیر مینائی کے بعد دورِ از کار یا غیر فطری شاعری کا دور ختم ہو گیا؟ - اے جھوٹ کی دیوی بیسویں صدی میں فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی۔ ہاں۔ تو ابھی میں یہ کہہ رہا تھا کہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ شاعری میں اصلیت کے جوہر چمکنے لگے۔ پھر بھی شاعری شاعری ہے اگر ایسی جھوٹ بات کہ "ذرہ چاہے تو تھکا دے مجھے صحرا ہو کر" قابلِ ترک ہے تو ایسی سچی بات کو آپ کیا کہیں گے کہ:۔ "ریل پنجاب کو جاتی ہے بھٹنڈا ہو کر"

نواب رندؔ نے اس شعر میں کوئی غلط بات نہیں کہی۔

اگر بُتی کا ہے گماں یا کہ ملاگیری کا رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہو کر

لیکن صباؔ کا یہ شعر جس میں بلبل کو کفن دینے کی بالکل جھوٹ بات کہی گئی ہے سچا شعر ہے یا جھوٹا؟

باغباں بلبلِ کشتہ کو کفن کیا دیتا پیرہن گل کا نہ اُترا کبھی میلا ہو کر

شاعری میں سچ بولنا محض کسی بات کی اطلاع دینے کو نہیں کہتے بلکہ ہمارے وجدان کو متاثر کرنے کو کہتے ہیں یا یوں کہئے کہ چیزوں میں جو ہمارے وجدان پر اثر ڈالنے کی صلاحیت ہے اس کا الفاظ کے ذریعہ سے احساس کرانا شاعری کی سچائی ہے۔ دو اور دو چار والی سچائی یہاں کام نہیں دیتی۔ ایک انگریزی نقاد کا قول ہے کہ ادب میں جتنی واقعیت آئے گی حقیقت و اصلیت اسی قدر کم ہو جائے گی۔ ڈکنس کو دیکھئے کہ مبالغہ اس کے خلاقانہ تخیل کی سانس ہے۔ اور آج کل کے افسانہ نگار بالکل سچی اور جچی تلی کردار نگاری کرتے ہوئے بھی اپنے ایک کردار کو زندہ نہ بنا سکے۔ یہی فرق شیکسپیر اور بین جانسن کے کرداروں میں ہے۔ اُردو غزل گو شعرا میں حالیؔ کوئی معمولی شاعر نہیں۔ مگر کاش اُسکی فطرت میں ذرا جھوٹ بھی ہوتا۔ وہ جھوٹ جو شاعرانہ سچائی کی جان ہے۔ وہ جھوٹ جو سچائی کی تلوار کی دھار ہے۔ وہ جھوٹ جس کے بل پر "سینۂ شمشیر سے باہر ہے دمِ شمشیر کا"

ہاں تو غزل سراسر داخلی شاعری ہے۔ بناوٹ۔ بے کیف مبالغہ۔ ضلع۔ جگت اور لفظی گورکھ دھندوں کو تو الگ کیجئے۔ لیکن حقیقی غزل گوئی منطق اور عقلیت سے بے نیاز ہوتے ہوئے بھی بادی النظر میں حضرت اصغرؔ مرحوم کے اس مصرع کا مصداق ہوتے ہوئے بھی کہ۔ "کچھ اصل ہے کچھ وہم ہے کچھ حُسنِ بیاں ہے" میرے نزدیک تو سراسر سچائی ہے اور ایسی سچائی ہے کہ اس قسم کا سچ بولنا آسان نہیں۔ یونہی اُردو غزل کے سلسلے میں آپ بیتی۔ جگ بیتی۔ معاملہ بندی۔ محاکات وغیرہ اس بات کی خبر دیتے ہیں کہ اُردو غزل گو جھوٹ کے لئے بدنام ہوتے ہوئے بھی سچائی کے قدر دان تھے۔ لیکن سامنے کی باتیں اور آئے دن کے واردات سے گزر کر جب وہ نفسیات اور وجدانیات

کے ان سبک حقایق کو لبِ اظہار عطا کرتے ہیں جب وہ حیات کے ان نازک مقامات کا پتہ دیتے ہیں جہاں ہمارے شعوری - نیم شعوری اور غیر شعوری وجود کی سرحدیں ملتی ہیں تو اسوقت دم بخود رہجانا پڑتا ہے -

یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں آواز آرہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی (فانی)

انسان حیوان ناطق ضرور ہے لیکن ناطق ہونے سے زیادہ اہم بات حیوان ہونا ہے - حیوان کا لفظ حیات سے مشتق ہے اور حیات کی سچائیاں نطق اور ادراک کے سانچوں میں نہیں ڈھالی جاسکتیں - زندگی کا راز حسرت کو آب نطق سے نہیں ملا، آب حیواں سے ملا -

میرے اُستاد پروفیسر ایس - جی - ڈن نے ایک بار اس عنوان پر طلبا سے کچھ لکھنے کو کہا (Art is more accurate than Science) یعنی سائنس (باوجود اپنی واقعہ پیمائی اور وضاحت کے) آرٹ سے کم سچا اور صحیح ہوتا ہے - میری آج کی گفتگو اُردو غزل میں واقعیت (Realism) کے بارے میں ہے حقیقت (Reality) کے بارے میں نہیں - اس لئے ہمیں افلاطون کے عالم مثال کی ماورائی فضا سے نیچے اُتر کر ارسطو کے ساتھ اسی سرزمین کی سیر کرنی ہوگی جس پر ہم آپ بستے ہیں - ہمیں ان اشعار پر نظر ڈالنی ہوگی جن میں واقعیت پر شعریت حاوی نہیں ہے - جن کی محض زبان ہی ٹکسالی نہیں ہے بلکہ جن میں تجربات اور احساسات بھی ٹکسالی ہیں اور جو اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ اُردو زبان اور اُردو شاعری نے بازار میں جنم لیا - دو اور دو چار والی بات تو شاعری نہیں ہے لیکن دو اور دو چار نما باتیں اپنی واقعیت کی وجہ سے لطف سے خالی نہیں ہوتیں - مثلاً میر کا یہ شعر سچ تو ہے لیکن غیر معمولی تاثرات کا حامل ہے :-

یہ کہتے وہ کہتے تھا دل میں کہ جو یار آتا سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

غالب ذرا اس سے نیچے اُتر کر عام تجربہ کی باتیں کرتا ہے :-

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

لیجئے مومن اس سچائی کو اور واضح کئے دیتا ہے :-

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

حسرت کا شعر ہے :-

کسی پر مٹے رہجانا ہے حسرت ہمیں کیا کام عمرِ جاوداں سے

میر کا شعر ہے :-

غرض کہ کاٹ دئے زندگی کے دن ہم نے وہ تیری یاد میں ہو یا تجھے بھلانے میں

مگر غالب کے ان اشعار میں طنز کے لہجے نے واقعیت کو اور نمایاں کر دیا ہے :-

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما کی عمر ۔۔۔ فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک ۔۔۔ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن ۔۔۔ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

اگر داغ کے اس شعر کو شدت احساس نے گمشدگی کی فضاؤں میں پہونچا دیا ہے ۔

ہجر کی یہ رات کیسی رات ہے ، ۔۔۔ ایک میں ہوں یا خدا کی ذات ہے

یا اگر غالب کا یہ شعر آپ کے تخیل کو زیادہ کاوش دیتا ہے :۔

بتلاؤں کیا ہوں کب سے جہانِ خراب میں ۔۔۔ شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تو مانوس اور متوازن لہجے میں حالی کا یہ شعر سنئے :۔

بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ ۔۔۔ اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

ناسخ بڑا جھوٹا شاعر ہے لیکن اس کے دو شعر سنئے :۔

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی ۔۔۔ عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

بات جن نازک مزاجوں سے کبھی اٹھتی تھی ۔۔۔ بوجھ ان سے سیکڑوں من خاک کا کیونکر اٹھا

اگر اصغر کے یہ اشعار آپ کی عقلیت سے اپیل نہیں کرتے ۔

کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے ۔۔۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا عریاں ہونا

گلوں کی عشوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی ۔۔۔ تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی

تو آتش کے اس شعر کو سنئے :۔

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی ۔۔۔ قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

کچھ لوگوں کو میر کے اس شعر کی برداشت نہ ہوگی :۔

ہوگا کسو دیوار کے سایہ میں پڑا میر ۔۔۔ کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو

اور کچھ لوگ کہیں گے کہ آتش کے اس شعر میں واقعیت کو شاعری لے اُڑی ہے

دھوپ میں سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا ۔۔۔ خاک پر سنگ دریار نے سونے نہ دیا

لیکن غالب کا یہ شعر تو مبالغہ یا محض رومانیت نہیں

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا ۔۔۔ تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

میر کے اس شعر کا ہمیں آپ کو تحمل نہ ہو :۔

ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن ۔۔۔ سینے میں دل کو جیسے کوئی ملا کرے ہے

یا غالب کے اس شعر کو آپ والہانہ سمجھیں :۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

تو کم از کم حالی کا یہ شعر تو اپنی واقعیت سے دلوں میں سما جاتا ہے :۔

عشق کہتے ہیں جسے سب یہ وہی ہو شاید خود بخود دل میں ہو اک شخص سمایا جاتا

میر کا یہ شعر تو واقعات کی تصویر کھینچ سکتا ہے :۔

آتے ہیں میر منھ کو بنائے خفا سے آج شاید بگڑ گئی ہے کچھ اس بے وفا سے آج

میر شکوۂ عشق کا بادشاہ ہے۔ ان اشعار کا لہجہ واقعیت میں کتنا ڈوبا ہوا ہے :۔

کوئی بیگانہ ہی کرتے نگاہ سو تم ہم سے منھ ہی چھپا کر چلے،

اچٹتی ملاقات کب تک رہے گی کبھو دل سے بھی تو مرا یار ہو گا،

میر حسن کہتے ہیں :۔

اس کی جب بزم سے ہم ہو کے تبنگ آتے ہیں اپنے ہی آپ سے کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں

حسرت کا یہ شعر سچ ہے یا جھوٹ ؟

شوق جب حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی ورنہ ہم اور کرم یار کی پروا نہ کریں،

یا ذرا خارجی رنگ اور مصحفی کے انداز میں حسرت کا یہ شعر دیکھئے :۔

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

مضطر خیر آبادی نے یوں تو غزل میں اپنے کو چھیلا بنا رکھا ہے اور نعتیہ کلام میں فرشتہ لیکن ان کے دو شعر سنئے :۔

اپنے قول و وفا کو بھول گئے تم تو بالکل خدا کو بھول گئے

ان سے دو دن بھی چاہ نبھ نہ سکی مضطر بے نوا کو بھول گئے،،

اب کچھ اور اشعار سنئے اور فیصلہ کیجئے کہ شاعر سچ بول رہا ہے یا حسب عادت جھوٹ بول رہا ہے :۔

کبھی کچھ رات گئے اور کبھی کچھ رات رہے ہم نے ان شوخ حسینوں کو نکلتے دیکھا

ہمارا دل ہمارا دل کبھی تھا، تری صورت تری صورت کبھی تھی

جب سے چھوڑی ہو محبت نظر آتے ہیں یہ خواب کھینچتا ہے کوئی دامن تو گریباں کوئی

ہاتھا پائی سے یہی مطلب بھی تھا کوئی منھ چومے کلائی تھام کے

حسب منشا دل پر شوق کی باتوں کا جواب دیدیا شرم میں ڈوبی ہوئی انگڑائی نے

دیکھا تو یوں وہ کہکے لگے منھ کو ڈھانپنے کمبخت پھر لگا مجھے نظروں میں بھانپنے

جب تلک کرتے رہے ذکور اسکا مجھ سے لوگ — جی میں کچھ سوچا کیا اور دل مرا دھڑکا کیا
پیام زیرلب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا — اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا
مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں — اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
عنایت ہے، توجہ ہے، کرم ہے، لطف و احساں ہے — مگر کیا کیجئے تیرے تغافلہائے پنہاں کو
وہ سوز و درد مٹ گئے وہ زندگی بدل گئی — سوال عشق ہے ابھی یہ کیا کیا یہ کیا ہوا
آئے بھی لوگ بیٹھے بھی۔ اٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈھتا تیری محفل میں رہ گیا

سچ بتائیے کیا اُردو غزل گو اتنا ہی جھوٹا ہے جتنا اسے مشہور کر رکھا ہے۔ ممکن ہے صرف عاشقانہ شاعری میں واقعیت کے ان نمونوں سے آپ کچھ اُکتا گئے ہوں۔ تو آپ ناخوش کیوں ہوتے ہیں۔ ولی دکنی کا یہ شعر سنئے:۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے — مرد کا اعتبار کھوتی ہے

اس زندگی میں ہے کیا سوائے عشق اور بھوک کے۔ اور اگر آپ اب بھی نہیں مانتے تو لیجئے، اکبر کا یہ شعر سنئے:۔

شرع کی رو سے جو شادی پہ نظر کرتا ہوں — جلوۂ کثرت اولاد نظر آتا ہے،

اب مجھ سے یہ نہ کہئے کہ یہ شعر مذاق سلیم سے گرا ہوا ہے کیونکہ شرع اور شاستر کی رو سے شادی پر نظر کرنا کہاں کا مذاق سلیم ہے۔

اُردو غزل میں سچائی۔ واقعیت اور اصلیت کا آغاز جرأت کی غزلوں سے ہوتا ہے جن میں معاملہ بندی یا حسن و جوانی عاشق و معشوق کی فطرت اور عملی و نفسیاتی کیفیتوں کی نہایت کامیاب ترجمانی کی گئی ہے۔ اس کے اشعار واقعیت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ میر نے جو اس پر "چوما چاٹی" کا الزام لگایا تھا وہ اسکی شاعری کی سچائی کی دلیل ہے۔ لیکن اُردو غزل میں نازک اور لطیف نفسیاتی واقعیت کا بادشاہ مومن ہے اور محض واقعیت کا بادشاہ غالب اور ٹھیٹھ عقلیت کی شاعری کو حساس اور مترنم بنانے والا حالی ہے۔ اس کا تخلص ہی اس امر کا شاہد ہے۔ دور حاضر کی غزل گوئی ایک طرف تو اقبال کے ان الفاظ میں جو انھوں نے عزیز کو لکھے تھے حقایق اور معارف کی ترجمانی کر رہی ہے دوسری طرف وہ مومن کے اس رنگ سے متاثر ہو رہی ہے جس میں تجربہ نفس و جذبات نہیں بلکہ وقوف جذبات کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن مومن جب ڈوب کر شعر کہتا ہے تو درک کا عنصر اسکے تخیل میں زیادہ تیز ہو جاتا ہے اور نغمگی اور شعریت ذرا دب جاتی ہیں۔ دور حاضر میں مومن کے انداز تخیل کو زیادہ شاعرانہ اور مترنم بنایا جا رہا ہے۔ مغرب کے سائنس اور فلسفے میں یہ دور عقلیت کو شک آمیز بنا رہا ہے اور شعور انسانی حیات و کائنات میں ماورائے عقل باتوں کا احساس کر رہا ہے۔ اسی سے اکثر اشعار میں آجکل باطل نما حقایق اور زندگی میں جو لطیف رجولیت مضمر ہے اس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ سچ بولنے میں بھی اُردو شاعر اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرتا کہ:۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل — لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

سیاسیات یورپ

(۳)

ہر ہٹلر کی جنگی اور مالی پالیسی

۷ مارچ ۳۶ء کو ہٹلر نے رھائن لینڈ میں اپنی فوجیں بھیجکر وہ سیاسی پیچیدگی پیدا کر دی جو ۱۹۱۹ء کے بعد یورپ کی سب سے زیادہ نازک صورت حال کہی جا سکتی ہے۔ صلحناموں کی رو سے رہائن لینڈ میں جرمنی کوئی فوج نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور اہل جرمن اس بے انصافی، پر غضبناک تھے —— رہائن لینڈ میں جرمنی کا فوجیں بھیجنا میثاق لوکارنو کے بالکل خلاف تھا جس کی رو سے برطانیہ و اٹلی دونوں نے اس سرحد کی حفاظت کی ذمہ داری لی تھی۔ گویا میثاق لوکارنو کی رو سے علاقۂ رھائن لنیڈ سے جرمنی کا بے تعلق رہنا ضروری تھا۔

جس وقت رہائن لینڈ میں جرمن فوجیں پہونچیں تو فرانس نے چاہا کہ اپنی فوجیں بڑھائے، مگر ہمت نہ ہوئی۔ انگریز اس بارہ میں خاموش رہنا چاہتے تھے اور خاموش رہے۔ اٹلی نے جو اپنے خلاف اقتصادی بائیکاٹ کی وجہ سے پہلے ہی سے ناراض تھا، اس باب میں برطانیہ، فرانس اور بلجیم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اٹلی اور جرمنی جو آسٹریا کے مسئلہ میں ایک دوسرے کے مخالف تھے متحد ہونا شروع ہو گئے۔ بلجیم کو ہٹلر کے اس فعل سے بہت پریشانی ہوئی کیونکہ ۱۹۱۴ء کی طرح وہ اب بھی جرمنی کے مقابلہ میں 'غیر مسلح' تھا۔ مگر ہٹلر نے اپنے اس فعل کو یہ کہکر حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی کہ فرانس اور روس میں جو سمجھوتہ ہونے والا ہے وہ خود میثاق لوکارنو کے خلاف ہے لہذا اگر اُس نے اُسی میثاق کی کسی دفعہ کی مخالفت کی تو کیا برا کیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فرانسیسی روسی معاہدہ سے بلجیم کو کیا واسطہ تھا جو اُسے خطرہ میں ڈالا گیا؟

بہرحال اس قضیہ کو طے کرنے کے لئے لندن میں یورپ کے سیاسی مدبرین کا ایک زبردست اجتماع ہوا اور دس دن تک بحث جاری رہی، برطانیہ کی رائے عامہ پہلے تو جرمنی کے موافق تھی لیکن آخر کار یہ سوچا گیا کہ ہٹلر کا

بار بار صلحناموں کی خلاف ورزی کرنا خطرہ سے خالی نہیں اس لئے اس کا سدباب ضروری ہے۔ الغرض کانفرنس جاری رہی اور آخرکار ہٹلر کے سفیر ہرفان ربن ٹراپ نے ہٹلر کی طرف سے ایک تجویز مصالحت کا اعلان کیا جس کے شرائط یہ تھے :۔

(۱) جرمنی، فرانس اور بلجیم کے مابین ایک پچیس سالہ صلحنامہ کہ اس دوران میں ایک ملک دوسرے کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے گا۔ (۲) مغربی فضائی معاہدہ۔ (۳) اخلاقی تخفیف اسلحہ (۴) ایک مشرقی ضمانتی میثاق بشمول لیتھونیا (باستثنا، روس)۔ (۵) جرمنی کی لیگ آف نیشن میں مراجعت بشرطیکہ یہ تمام شرائط منظور کرلی جائیں (۶) بڑے توپخانوں اور ٹینکوں کو ختم کردینا ان کے علاوہ اس تجویز میں یہ تحریک بھی کی گئی تھی کہ نہ صرف جرمنی بلکہ فرانس میں بھی استصواب رائے عامہ کیا جائے۔

اس تجویز صلح کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر تو یہ بہت عمدہ چیز ہے مگر دراصل ڈھول کے اندر پول ہے جنگ عظیم کے بعد یورپین ممالک میں کوئی دوسو مصالحانہ میثاق ہوئے مگر کوئی ایک بھی موثر ثابت نہیں ہوا۔ امدادی میثاق البتہ کارآمد ثابت ہوسکتے تھے اور اسی لئے ہٹلر کو ان کی زیادہ خواہش تھی۔ اس سے فایدہ یہ تھا کہ اس طرح اُسے نہ صرف اپنے دشمنوں میں سے ایک ایک کو ختم کردینے کا موقع تھا بلکہ مغرب کی طرف سے مطمئن ہوکر وہ مشرق کی طرف اپنے ہاتھ پاؤں بڑھا سکتا تھا۔ اخلاقی تخفیف اسلحہ کی تحریک، جس میں فرانس اور جرمنی کے مابین نفرت بڑھانے والی کتابوں کی اشاعت کی بندش بھی شامل تھی ایک ایسے ملک کی طرف سے پیش ہونا جہاں کے نوجوانوں کو دوسروں کے خلاف بھڑکایا جاتا ہو، حیرت انگیز چیز تھی۔ ماہرین کے نزدیک تعدادی بنیاد پر ایک مغربی فضائی معاہدہ اصطلاحی (Technical) ناممکنات میں سے تھا۔ رہ گئے بڑے توپخانے اور ٹینک، سو جرمنی انھیں چیزوں میں سب سے زیادہ کمزور تھا لہذا اس کے لئے یہی بہتر تھا کہ یہ سامان کسی ملک کے پاس نہ رہے۔

اس کے بعد سیاسی مول تول شروع ہوا مگر ہٹلر کا جو مقصد تھا وہ حاصل ہوچکا تھا یعنی رہائن لینڈ پر فوجی قبضہ! البتہ ایک چیز ہٹلر کو خوش نہ آئی اور وہ یہ کہ دول لوکارنو نے ایک قرطاس ابیض شایع کیا کہ برطانیہ، فرانس اور بلجیم میں جرمن چیرہ دستی کے خلاف ایک حفاظتی فوجی اتحاد قایم کیا جائے گا۔ اسی کے بعد تینوں ملکوں کے سپہ سالاروں میں گفت وشنید بھی ہونے لگی۔ بعدہٗ برطانیہ کے وزیر خارجہ، مسٹر اڈن نے ہٹلر کے پاس ایک مراسلہ بھیجا کہ آیا وہ اپنے مشرقی میثاق میں روس کو شامل کرنے کے لئے تیار ہے یا نہیں دوسرے وہ اس امر کے لئے کیا ضمانت دیتا ہے کہ آیندہ صلحناموں کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔ یہ سوالات ہٹلر کے پاس اسوقت پہونچے۔ جب یورپ میں ایک تازہ واقعہ سے پھر سنسنی پیدا ہوگئی تھی۔ حبش کا دارالسلطنت عدیس ابابا فتح ہوگیا تھا اور اس کا بادشاہ ہیلی سلاسی اپنے ملک سے بھاگ گیا تھا۔ ہٹلر نے مسٹر اڈن کے اس نوٹ کا آج تک جواب نہیں دیا۔

ستمبر ۳۶ء میں برطانیہ نے جدید میثاق لوکارنو کی تحریک شروع کی لیکن جرمنی نے جو جواب دیا وہ بہت مبہم تھا جنوری ۳۷ء میں مسٹر اڈن نے پھر گفت وشنید کرنا چاہی مگر جرمنی نے پھر ٹالدیا۔

اس اثنار میں دو واقعات ایسے ہوئے جس سے دوسری طاقتوں کو تازہ خطرات پیدا ہو گئے:۔

(۱) ۲۵ نومبر ۳۶ء کو جرمنی اور جاپان نے ایک قسم کے سمجھوتہ کا اعلان کیا۔ یہ سمجھوتہ جو بین الاقوامی اشتراکیت کے خلاف کیا گیا تھا پانچ سال کے واسطے ہوا تھا۔ اس سمجھوتہ کی رو سے جرمنی اور جاپان کی ایک مستقل کمیٹی بنی جسکا کام اشتراکیت کے مقابلہ میں حفاظتی اور تحقیقاتی مشورے کرتے رہنا تھا۔

(۲) اسی دوران میں روم و برلن کے درمیان مفاہمت ہوئی اور ہر چند یہ ہٹلر اور مسولینی کے درمیان کوئی باضابطہ سمجھوتہ نہ تھا مگر چونکہ دونوں ملکوں کی پالیسی اب بالکل ایک ہو گئی تھی۔ اس لئے جرمنی اور اٹلی دونوں اسپین کے جھگڑے میں حصہ لینے لگے اور دونوں نے ایک ہی دن جنرل فرنیکو کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ گورنگ، بلمو برگ اور نیورتھ، روم گئے مسولینی نے خود بھی جرمنی جانے کا اعلان کیا (اور بعد کو گیا بھی۔ اب ہٹلر کے متعلق خبر ہے کہ وہ بھی روما جائے گا)

گو روم باضابطہ طور پر جدید جرمن - جاپان معاہدہ میں شریک نہیں ہوا مگر اس سمجھوتہ پر اٹلی میں اظہار اطمینان و مسرت ضرور کیا گیا اور اطالوی وزیر خارجہ نے یہ کہا کہ چونکہ بحر الکاہل سے اٹلی کا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے اس لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ اشتراکیت کی مخالفت میں اٹلی جاپان کے ساتھ متحد الخیال ہے۔ دنیا کے تین سرگرم اور اپنی فتوحات کو وسعت دینے والے ممالک، جرمنی، جاپان اور اٹلی کے اس اتحاد نے دنیا کو ایک بار پھر چونکا دیا!

جنگ کئی وجوہ کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہٹلر کے لئے جنگ ناممکن ہے۔ یہاں اس مسئلہ پر تھوڑا سا تبصرہ کر دینا بہتر ہوگا!۔ ایک دلیل یہ پیش کی جا سکتی ہے کہ جرمنی کے پاس جنگ کے لئے روپیہ نہیں ہے، ۔لیکن مفلسی نے جنگ کو کبھی نہیں روکا ہے! ——— ہو سکتا ہے کہ روپیہ کی کمی کے سبب سے جنگ کرنے میں دقتیں پیش آئیں مگر ایک ایسے ملک کو جو افلاس کی وجہ سے اپنی جان کی بھی پرواہ نہ کرتا ہو، جنگ کی صورت میں ان ملکوں سے کم ہی نقصان اٹھانا پڑے گا جو کافی دولتمند ہیں چنانچہ اقتصادی بائیکاٹ کے باوجود اٹلی نے حبش میں اپنی جنگ جاری رکھی۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جرمنی کے پاس جنگ جاری رکھنے کے لئے کافی مقدار میں خام پیداوار نہیں ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جرمنی کے پاس آج خام پیداوار اتنی ہی مقدار میں ہے جتنی کہ ۱۴ء سے پہلے تھی اور باوجود اپنی تجارت کے مسدود ہو جانے کے وہ ۴ برس تک سرگرمی سے لڑتا رہا۔ تیسری یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ جرمن پارلیمنٹ میں ہٹلر کے مخالفین اب بھی موجود ہیں اور جنگ چھڑ جانے کی حالت میں مزدور طبقہ لڑنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جرمنی اور روس ایسے ملکوں میں جہاں ایک پارٹی کے علاوہ دوسروں کو ابھرنے نہیں دیا جاتا مخالفوں کی طاقت ہر سال کم ہوتی جاتی ہے اور بقول ایک جرنلسٹ کے کافی پروپیگنڈا کرنے سے ہر چیز اچھی معلوم ہونے لگتی ہے یہانتک کہ

موت بھی!

اس کے علاوہ ہٹلر کے راستہ میں کچھ اور بھی مشکلات حائل ہیں مثلاً آسٹریا اور میمل کا مسئلہ۔ درۂ برنر میں ہٹلر کی فوجوں کو آسٹریا کی طرف بڑھنے سے روکنے کے لئے مسولینی کی افواج موجود رہتی ہیں (مگر اب کابینۂ آسٹریا میں ایک نازی ہم خیال وزیر مقرر ہونے اور اٹلی کے خاموش رہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر کا اقتدار آسٹریا کے اندرونی انتظام میں بڑھتا جا رہا ہے اور مسولینی کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتا) میمل میں بھی ہٹلر پولینڈ سے سمجھوتہ ہونے کی وجہ سے کوئی ہنگامہ نہیں کرنا چاہتا۔ میمل، لوتھینا کی ریاست میں ہے مگر پولینڈ چاہتا ہے کہ لیتھونیا پر بجز اس کے کوئی اور دست تصرف دراز نہ کرے اور ہٹلر یہ چاہتا نہیں کہ اس وقت پولینڈ سے بھی اس کی ٹھن جائے

روس کے ساتھ ہٹلر کی دشمنی اظہر من الشمس ہے۔ ایک مرتبہ تو اس نے ایک انٹرویو میں یہ کہا تھا کہ ہم کسی مشرقی میثاق میں شامل نہیں ہو سکتے کیونکہ ہمیں یہ کسی حالت میں گوارا نہ ہوگا کہ ہم روس کے ساتھ مل کر کسی دوسرے سے جنگ کریں اور اس قسم کے عہد نامہ پر دستخط کرنے کے بجائے، میں مرجانا زیادہ پسند کروں گا۔

لیکن جب ہم تصویر کے دوسرے رُخ پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی، جنگ کے لئے ہر طرح کا سامان تیار کر رہا ہے مثلاً جرمن فوج کی تنظیم اور فضائی بیڑہ میں اضافہ۔

دوسرے یہ کہ جرمنی کی یہ خواہش کہ مشرق یا وسط یورپ میں اس کے مقبوضات بڑھ جائیں، صرف جنگ ہی کی صورت میں پوری ہو سکتی ہے۔

تیسرے یہ کہ آسٹریا میں جرمنی کی ریشہ دوانیاں، لیتھونیا کے خلاف دھمکیاں، سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ، رومانیا، یوگوسلیویا غرضکہ ہر جگہ جرمن باشندوں کی سازشیں، بجائے خود ثابت کر رہی ہیں کہ نازی کیا چاہتے ہیں۔

چوتھے یہ کہ نازی تحریک نے جو دراصل ایک فوجی تحریک ہے ملک میں ایسی جنگی اسپرٹ پیدا کر دی ہے جسکا ہر وقت عملی صورت میں مظاہرہ ہو سکتا ہے خواہ ہٹلر چاہے یا نہیں —— اس کے علاوہ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ۵ برس کے بعد لیتھونیا، جرمنی کا حبش بن جائے؟

اس وقت جرمنی کی پالیسی صرف یہی نہیں ہے کہ جنگ عظیم میں اُس نے جو کچھ ضایع کر دیا ہے اُسے پھر حاصل کر لے بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اُس سے بھی زیادہ مل جائے۔ نازی تحریک کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تمام جرمن اقوام ایک ہو جائیں جس کے معنی یہ ہیں کہ آسٹریا، اور پھر زکوسلیویکا، سوئٹزرلینڈ، ڈنمارک، ہالینڈ اور شاید اطالوی ٹرال اور ڈنیزگ کے جرمن سب ملکر ایک جدید متحدہ جرمنی کے اجزا بن جائیں۔ جرمنی کو اپنی سلطنت وسیع کرنے کی یہ خواہش اسوجہ سے نہیں ہے کہ اس کی پیدائش کی رفتار زیادہ ہو رہی ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ دنیا کے ملکوں میں اپنے وقار کو زیادہ بڑھانا چاہتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جرمنی میں پیدائش کی رفتار بجائے زیادہ ہونے کے کم ہوتی جا رہی ہے چنانچہ تازہ ترین اعداد و شمار کا حساب

لگانے سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ (موجودہ جرمن حدود کے اندر) ۱۹۷۵ء میں اس کی آبادی صرف ۶۰ کروڑ ۹۰ لاکھ رہ جائے گی حالانکہ اسوقت اس کی آبادی ۶ کروڑ ۵۰ لاکھ ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ دوسرے ملکوں پر قبضہ کرکے وہاں جرمن آبادی کی کھپت کی جائے گی سو اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ۱۹۱۴ء میں تمام جرمن نوآبادیات میں جرمنوں کی مجموعی آبادی تقریباً ۲۵ ہزار تھی جو اور ملکوں کو چھوڑ کر صرف پیرس میں بسنے والے جرمنوں کی آبادی سے بھی کم تھی!

معاہدہ ورسیلز میں جرمنی کے ساتھ جو ناانصافیاں کی گئی تھیں ان کا ازالہ، ہٹلر کے برسر اقتدار ہونے سے قبل ہی ہونے لگا تھا۔ جمہوریت دیمر میں بیرونی فوجی اقتدار ختم کر دیا گیا تھا، اسٹرس مان کے ماتحت رہائن لینڈ سے بیرونی افواج چلی گئی تھیں اور برونگ وپیتین کے عہد میں تاوان جنگ کی ادائگی بھی بند ہوگئی تھی۔ پیپن شلیشر کے عہد حکومت میں اتحادیوں نے یہ بھی تسلیم کرلیا تھا کہ فوجی قوت میں جرمنی دوسرے ملکوں سے برابری کرسکتا ہے۔ ہٹلر نے اس سلسلہ کو جہاں یہ فوجی بھرتی، سار پر قبضہ اور عہد نامۂ ورسیلز کی دفعات کی مذمت کرکے جاری رہنے دیا ہے مگر اس کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسولینی اُس سے خوش نہیں (اب ایسا نہیں معلوم ہوتا) ڈنمارک اُس سے ناراض ہے، اور ہالینڈ اور سوئٹزرلینڈ اُس سے بگڑے ہیں۔ اُس نے فرانس کو اپنے خلاف متحد کر دیا ہے۔ کیونکہ فرانس کا داہنا بازو جرمنی سے متنفر ہے اور بایاں ہٹلر سے، اُس نے آسٹریا کو اُس وقت اپنے سے الگ کر دیا جب اُسے اُس کی گود میں ہونا چاہئے (معلوم نہیں آیندہ کیا صورت پیدا ہو) اُس نے روس، فرانس اور یوروپ کی چھوٹی ریاستوں کو اپنے خلاف متحد کرایا اور سب سے بڑھکر یہ کہ روس کو جمعیتہ اقوام میں داخل کرا دیا۔

ایک چیز کا البتہ اُس نے خیال رکھا، وہ یہ کہ انگلستان کی دوستی کو ہاتھ سے نہیں کھویا۔

بہرحال، جرمنی، یوروپ کے لئے ایک معمہ ہو رہا ہے۔ بہترین صورت یہ ہے کہ جرمنی کو طاقتور بننے کا موقع دیا جائے، مگر بہت زیادہ طاقتور نہیں۔ جرمنی کو اُس کا کھویا ہوا وقار مل جانا چاہئے لیکن اگر جرمنی اتنا طاقتور ہوجائے کہ اپنی سابقہ شکست کے عوض میں دوسری جنگ لڑنا چاہے تو ——؟ بہرحال دو چیزیں صاف ہیں۔ جرمنی ہی یوروپ میں ایک عالمگیر جنگ کے شعلے بھڑکا سکتا ہے، دوسرے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہٹلر کے کیا ارادے ہیں

۱۹۱۴ء کے موسم گرما اور ۱۹۳۵ء کے موسم خزاں کا اگر مقابلہ کیا جائے تو بہت سی باتیں ملتی جلتی نظر آئیں گی ولیم ثانی کے گرد بھی ایک سازشی گروہ تھا، ہٹلر کے پاس بھی ہے، ولیم ثانی، "چمکتی ہوئی زرہوں" کی باتیں کیا کرتا تھا، ہٹلر بھی اپنے ہتھیاروں کی سلامتی کی دعا مانگتا ہے، ولیم ثانی نے اپنے بحری بیڑہ سے برطانیہ کو چیلنج دیا تھا۔ گوئرنگ اپنے فضائی بیڑے سے چیلنج دے رہا ہے، لارڈ ہالڈین ۱۹۱۲ء میں برلن کسی مقصد کو ساتھ لیکر آئے تھے اور ۱۹۳۵ء میں سر جان سائمن آئے۔

مگر خود ہٹلر، جنگ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:۔ "یورپ میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جو جنگ کو حق بجانب قرار دے سکے۔ میں بالکل پاگل نہیں ہوں۔ جنگ سے کوئی بات طے نہ ہوگی بلکہ معاملات اور زیادہ خراب ہو جائیں گے۔ اس سے ہماری نسلوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور وہ وقت آجائے گا کہ ایشیا اور بالشویزم، یورپ میں حکومت کرنے لگیں ۔۔۔۔۔ مجھے گھر پر بہت کام کرنا ہے ۔۔۔۔۔ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ میں ایک نئی جنگ چھیڑ کر اپنے کام کو خراب کر دوں گا؟"

حقیقت یہ ہے کہ اگر بغیر جنگ کئے اس کا مقصد حاصل ہو جائے تو ہٹلر واقعی جنگ نہیں چاہتا اور یہ بھی اصلیت ہے کہ وہ جنگ کے لئے تیار نہیں ـــــ ابھی!

ہٹلر کے مشیرانِ امور خارجہ

یہاں پر نہایت مختصر الفاظ میں ہٹلر کے مشیران امور خارجہ کا کچھ ذکر مناسب ہوگا۔

بیرن فان نیورتھ ـــــ جرمنی کا سرکاری وزیر امور خارجہ۔ نیورتھ تازی نہیں ہے۔ مگر پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ نے ہٹلر کو چنسلر مقرر کرتے وقت اُس سے یہ اصرار کیا تھا کہ نیورتھ، کابینۂ جدید میں وزیر خارجہ رہے گا۔ غالباً ہنڈنبرگ کا اس سے یہ مقصد تھا کہ اس طرح نازی پالیسی کی انتہا پسندی پر ایک قسم کی بندش عاید رہے گی لیکن جب ہٹلر کو نیورتھ سے سابقہ پڑا تو مقدم الذکر کو وہ بہت عمدہ آدمی معلوم ہوا اور وہ نیورتھ کے فیصلوں کی بڑی قدر کرنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک نیورتھ کو کوئی گزند نہیں پہونچا ہے۔ دوسرے نیورتھ کے خیالات خواہ ہٹلر سے دوسری باتوں میں مختلف ہوں مگر ایک مسئلہ پر دونوں متفق الرائے ہیں یعنی یہ کہ برطانیہ سے دوستی رکھی جائے۔

فان ربن ٹراپ ـــــ جرمن سفیر متعینہ لندن، ہٹلر کا امور خارجہ میں خاص مشیر کار ہے۔ ربن ٹراپ ہی نے جون ۳۵ء میں اُس جرمن وفد کی قیادت کی تھی جس نے انگریزی۔ جرمنی بحری معاہدہ پر دستخط کئے تھے۔

یہ معاہدہ کئی وجوہ سے بہت اہم تھا! (۱) اس صلحنامہ کی رو سے برطانیہ نے جرمنی کو از سر نو بحری بیڑہ تیار کرنے کی اجازت دیدی اور جرمنی کو اس کی اجازت ملگئی کہ وہ برطانیہ کے بحری بیڑہ کی ایک تہائی تعداد کے برابر اپنا بیڑہ تیار کر سکتا ہے یعنی بحری قوت کے معاملہ میں جرمنی اور فرانس مساوی کر دئے گئے۔ (۲) یہ معاہدہ برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے مبینہ 'متحدہ محاذ' کے اعلان کے بعد ہوا ہے اس لئے اس 'متحدہ محاذ' سے جو امیدیں قایم ہوئی تھیں وہ ختم ہو گئیں۔ (۳) برطانیہ نے عین اُس زمانہ میں جبکہ وہ جرمنی پر ایک 'غیر قانونی' بحری فوج قایم کرنے کا الزام لگا رہا تھا اُسے ایک 'قانونی' بحری فوج قایم کرنے کی اجازت دیدی جس سے جرمنوں نے یہ سمجھا کہ برطانیہ کی طرف سے دوستی کا یہ اچھا مظاہرہ ہے۔

ربن ٹراپ نے انگلستان اور سوئٹزرلینڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اور انگریزی و فرانسیسی بلا تکلف

بولتا ہے اور اسی وجہ سے ہٹلر اس کی بہت زیادہ قدر کرتا ہے۔

فان پیپن — سابق چنسلر ہٹلر کا سفیر خاص متعینہ آسٹریا ہے۔ پیپن کے دو خاص دوست اور ساتھی جن میں سے ایک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اس کی تقریر تیار کرتا تھا خاص اسی کے دفتر میں نازیوں کے ہاتھوں مارے گئے مگر پیپن نے سکوت کے ساتھ اس کو برداشت کیا اور اب نازی حکومت ہی کی طرف سے آسٹریا میں جرمنی کا سفیر ہے۔

روزن برگ فلسفی روزن برگ، اُمور خارجہ کا ماہر ہے اور ہٹلر کا خاص آدمی۔ وہ ہٹلر کے اخبار والکشی بوباختر، کا اڈیٹر، اور نازی پارٹی کے سیاسی شعبۂ خارجہ کا افسر ہے۔ ایک چیز "روزن برگ اسکیم" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اسکیم مشرق میں جرمن مقبوضات بڑھانے کی اسکیم ہے جس کی ہٹلر نے آج تک تردید نہیں کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہٹلر اپنے خیالات، روزن برگ سے ہی لیتا ہے۔

مالیات جرمنی خیال یہ ہے کہ جرمنی کی اقتصادی حالت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہے مگر حقیقت غالباً یہ نہیں ہے۔ ۳۷ء کے آخر میں جرمن بیکاروں کی تعداد ۱۸۷۰۰۰۰ تھی۔ ۲۹ء کے مقابلہ میں جو مالی حالت کے اعتبار سے جنگ عظیم کے بعد جرمنی کا بہترین سال تھا یہ تعداد صرف ۶ لاکھ زیادہ ہے! جرمن مصنوعات ۳۰-۲۹ء کے برابر ہیں۔ ۲۹ء میں جرمن اشیاء برآمد کی آمدنی ۱۳ ارب تھی۔ ۳۳ء میں ان کی آمدنی صرف ۵ ارب رہ گئی اور ۳۴ء میں ۴ ارب ۸ الاکھ ۷۰ ہزار! جرمنی کی صنعت و حرفت خاص کر اس کی بیرونی تجارت پر منحصر ہے مگر وہ بھی جرمن طلائی سکہ کی قیمت بڑھ جانے اور دوسرے ملکوں میں اشیاء درآمد پر مختلف بندشوں اور بین الاقوامی بائیکاٹ کی وجہ سے گھٹنے لگی۔

مگر پھر بھی جرمنی کو درآمد کا سلسلہ جاری رکھنا ضروری تھا کیونکہ اُسے خام پیداوار کی سخت ضرورت تھی۔ اُسے ریشم، ربر، نکل، ٹین، تانبہ، کرومیم وغیرہ درکار تھے اور ان چیزوں کو کچھ نقد اور کچھ ادھار کر کے اس نے کافی مقدار میں خریدا مثلاً جرمن اسٹیل ٹرسٹ نے ۳۳ء میں ۹۰۰۰ ۲۴ ٹن سوئٹزرلینڈ کا لوہا خریدا تھا مگر ۳۴ء میں اسی کمپنی نے ۸۰۰۰ ۴ ٹن خریدا۔ ۳۲ء اور ۳۵ء کے درمیان خام نکل (جو سامان جنگ کے لئے ضروری ہے) اس نے سہ چند خریدا۔ اس کے علاوہ زرعی ترقی اور زرعی پیداوار بڑھانے کی بھی ہر ممکن کوشش کی گئی تاکہ جنگ کی صورت میں اگر سامان خورد و نوش کی بندش ہو جائے تو ملک پر اثر نہ پڑے۔ مزید براں ہر سعی بلیغ اس امر کی بھی کی گئی کہ ایک چیز دوسری چیز سے نکالی جائے مثلاً برادہ سے شکر اور آٹا، لکڑی اور کوئلہ سے گیسولین، کیمیاوی ریشوں سے کپڑا اور کوئلہ سے مکھن وغیرہ۔ ملازموں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی تنخواہوں سے "فضائی تحفظ" اور مزدوروں کی انجمنوں کو چندہ دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نوکروں کی تنخواہیں چندوں کی بھرمار سے مستقلاً کم ہو گئیں۔

لیکن پھر بھی حکومت کو اتنی مدوں میں روپیہ خرچ کرنا تھا کہ حساب سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔ حکومت کو اشیاء درآمد

کی قیمت بھی دینا تھی، بے روزگاری دور کرنے کے لئے مختلف تعمیری اسکیموں میں روپیہ بھی خرچ کرنا تھا، تجدید اسلحہ کے واسطے الگ روپیہ درکار تھا اور پھر ملک کا معمولی بجٹ بھی تیار ہونا تھا اور یہ سارا کام ہٹلر کے مشہور مالیات ڈاکٹر شاسٹ (Schacht) کو کرنا تھا۔ غیر ملکوں میں اندازہ کیا گیا تھا کہ صرف اسلحہ سازی کی مد میں جرمنی ۶۰۰۰۰۰۰۰ پاؤنڈ ہر سال خرچ کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنا روپیہ کیونکر اور کہاں سے آتا ہے؟ بتایا جاتا ہے کہ شاسٹ نے دو ترکیبیں کی ہیں۔ پہلے تو اُس نے روز کا کام چلانے کے لئے بنکوں، اور بیمہ کمپنیوں وغیرہ سے قرض لینا شروع کیا یہ ایک طرح کا زبردستی کا قرض تھا اور اس کے معاوضہ میں قرض دینے والی کمپنیوں کو صرف ایک سرکاری تمسک مل جاتا تھا کہ ہم نے تم سے اتنا قرض لیا ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے سابقہ سرکاری قرضوں کی شرح سود گھٹا کر بھی آمدنی میں کچھ اضافہ کیا۔ ان تمام کارروائیوں کے معاوضہ میں حکومت نے عوام کو یقین دلایا کہ وہ یہ سب کچھ ملک کے تحفظ اور قیام امن کے لئے کر رہی ہے حالانکہ روپیہ جنگ کی تیاری میں صرف ہوتا تھا۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ شاسٹ خواہ غیر ملکیوں کے تجارتی نقطۂ نگاہ سے ایماندار آدمی نہ ہو لیکن جرمنی کی مالی حالت سنبھالنے میں اُس نے بہت مدد کی اور اُس نے جرمنی کو دنیا کی تاریخ میں کامیاب ترین "دیوالیہ" بنا دیا۔ جرمن تجارتی کمپنیاں، انگلستان، امریکہ، فرانس اور اسکنڈینویا وغیرہ کی قرضدار ہیں اور ان ممالک کے تاجر جرمنی کو اپنے ملکوں کی پیداوار بھیجتے ہیں لیکن شاسٹ نے ان سے کہا کہ تم ہماری چیزیں بھی خریدو ورنہ ہم اپنا قرض نہیں ادا کر پائیں گے کیونکہ ہمیں اگر روپیہ ملیگا ہی نہیں تو تمھیں دیں گے کہاں سے۔ شاسٹ مسلسل کئی مرتبہ قرضوں کی جزوی ادائی کے التوا کا اعلان کرتا رہا اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ ہمارا کاروبار نہ چلا تو ہم ادائی سے قطعاً انکار کر دیں گے۔

بہرحال ان قرضوں سے جرمنی اپنے سامان جنگ میں اضافہ کرتا رہا اور اُس کے آئندہ دشمن مثلاً فرانس، روس اور انگلستان وغیرہ قرض دے دے کر اس کی امداد کرتے رہے۔ سب سے زیادہ لطف کی بات اُسوقت ہوئی جب دسمبر ۳۴ء میں انگلستان کے بنک نے یہ فیصلہ کیا کہ جرمنی کو ساڑھے سات لاکھ پونڈ قرض دئے جائیں تاکہ وہ اپنے پرانے تجارتی قرضوں کو ادا کر سکے ـــــ اور سات منٹ میں آبنائے انگلستان عبور کر کے لندن پر گولہ باری کرنے والے ہوائی جہاز تیار کرے!

سامان تجارت کے تبادلہ کے سلسلہ میں بھی شاسٹ بہت کامیاب رہا۔ اُسے ریاستہائے بلقان سے خام پیداوار خریدنے کی ضرورت تھی مگر نقد روپیہ پاس نہ تھا۔ چنانچہ وہ ان ریاستوں کے دارالحکومتوں میں پہونچا اور یہ سمجھوتہ کر لیا کہ جرمنی ان کی تمباکو، روئی اور معدنیات خریدے گا مگر بجائے نقد روپیہ کے ان کے معاوضہ میں جرمنی اپنے مصنوعات دے گا۔ بلقان کے اکثر بڑے بڑے تاجروں کا روپیہ جرمنی میں پھنسا تھا، شاسٹ نے کہا کہ ان

روپیوں کی ادائی بھی وہ بذریعہ تبادلۂ مصنوعات (خصوصاً گولی، بارود وغیرہ) کریگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلقان کی بعض ریاستیں مثلاً یونان نے اپنی تمباکو کے عوض جرمنی کے کارتوس اور بارود وغیرہ لینا شروع کر دیا۔ اس طریقہ سے ریاستہائے بلقان میں جرمنی کا سیاسی اور اقتصادی اثر پھیلنے لگا۔ اس کے بعد شاشٹ نے یہ کیا کہ تبادلہ میں جو مصنوعات وہ حاصل کیا کرتا تھا انھیں بجائے جرمنی لانے کے کسی دوسرے ملک کے بندرگاہ بھجواتا اور وہاں نقد سکوں کے عوض میں انھیں فروخت کر کے نقدی حاصل کرتا۔ اس روپئے سے وہ ان ملکوں سے سامان خریدتا جو تبادلہ کی تجارت اس سے نہیں کرتے تھے!

شاشٹ کی مختصر سوانح حیات

شاشٹ ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوا اور جرمنی کی متعدد یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی سب سے پہلے وہ ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے ملازم ہوا مگر اسکی قابلیت کا پتہ ڈائرکٹروں کو تھوڑے ہی عرصہ میں چل گیا اور وہ بہت جلد ترقی پاتے ہوئے اسی بنک کا ڈپٹی ڈائرکٹر بنا دیا گیا۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے بنک کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔

۲۳ء میں جب جرمن 'مارک' (سکہ) کی ساکھ بگڑ گئی تو اسے کرنسی کمشنر مقرر کیا گیا اور اس نے دوسرا سکہ جاری کر کے جرمن کرنسی میں بدنظمی نہیں پیدا ہونے دی۔ اس کے بعد اسے وزارت مالیات پیش کی گئی مگر جب اس نے یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تو جرمن بنک کی صدارت پیش کی گئی جسے اس نے منظور کر لیا۔ ۳۰ء میں اس نے اس عہدہ سے استعفا دیدیا مگر مارچ ۳۳ء میں ہٹلر نے اسے پھر اسی جگہ پر متمکن کر دیا۔ اسے ۲ لاکھ مارک سالانہ تنخواہ ملتی ہے جو جرمنی میں سب سے بڑی تنخواہ ہے۔ اسے وزارت اقتصادیات بھی آسانی سے مل سکتی تھی مگر اسے غالباً اس نے اس وجہ سے نہیں منظور کیا کہ اس کی تنخواہ صرف ۳۸ ہزار مارک سالانہ تھی۔

شاشٹ، گوئیلس اور پارٹی کے بائیں بازو کو نہیں پسند کرتا ہے، اسے اس کا بھی احساس ہے کہ یہودیوں کے خلاف جہاد کرنے سے ملک کی بیرونی تجارت کو نقصان پہونچیگا چنانچہ ایک مرتبہ اس نے اپنی تقریر میں اپنے خیالات کا کچھ اظہار بھی کر دیا تھا مگر گوئیلس نے اس تقریر کو شایع نہیں ہونے دیا۔

ضرورت ہے

نگار جنوری و اپریل تا دسمبر ۳۴ء — جون ۳۵ء — مئی، جولائی و اگست ۳۶ء۔
فروری و ستمبر ۳۷ء کے پرچوں کی اگر کوئی صاحب علٰحدہ کرنا چاہیں تو دفتر میں اطلاع دیں۔

منیجر نگار

ادب اور دنیا کا مستقبل [1]

ادب ہماری زندگی کا وہ متحرک اور لرزاں آئینہ ہے جس میں انسانی زندگی کا مقصد، انسانوں کی شخصیت، اُنکے رنج و غم، اُن کی ہنسی خوشی اور اُن کے تمام دوسرے احساسات اور خیالات کی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں جس طرح آئینہ ہمیں دھوکا نہیں دیتا کہ ہمارے چہرے کے داغ اور دھبے ہم سے چھپالے اُسی طرح سچا ادب بھی ہماری زندگی کی حسین اور قبیح حقیقتوں کو بے نقاب کرکے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آئینہ بالکل دھندلا ہو اور عکس اُس میں صاف دکھائی نہ دے، ادب پر اس طرح کے پردے ڈال دئے گئے ہوں کہ وہ ہماری سچی ترجمانی نہ کرے مگر جس کو ہم حقیقی ادب کہتے ہیں اُس کا فرض یہی ہے کہ جس دور میں ہمارے سماج کی جو حالت رہی ہے اُس کا سچا نقشہ ہمارے سامنے لائے اور آنے والی زندگی کی پر پیچ منزلوں کی طرف رہنمائی کرے۔ اگر ادب نے یہ نہ کیا بلکہ سچائیوں سے جان بچا کر ہمیں تخیلی روحانیت اور دور از کار تصوف کی طلسمی دنیا میں ہمیں گم کردہ منزل بنا دیا یا دور دور کی باتوں میں ہمیں بھلائے رکھا تو گویا اُس نے اپنی وہ بڑی خدمت انجام نہیں دی جو اُس کے سپرد تھی۔

ادب کی ہمہ گیری کے سلسلہ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ادب کو دنیا کی وہ آنکھ ہونا چاہئے جو ہمارے نظام معاشرت کے تار تار سے گزر جائے، ادب کو دنیا کا وہ دل ہونا چاہئے جس پہ کائنات کے دکھ درد کا ہر راز فاش ہو۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ کتابیں صرف دلچسپی کے لئے لکھی اور پڑھی جائیں بلکہ اُن سے اب ہم اپنی زندگی بنانے اور انسانیت کو سنوارنے کا کام لیتے ہیں۔ ادب فنونِ لطیفہ کا کوئی بے معنی اور نیم شعوری تصور نہیں بلکہ ہمارا وہ حربہ ہے جس پر ہم بھروسہ کر سکتے ہیں۔ ادیب اور مصنف اگر زندگی کی مشکلوں سے بھاگنے والے انسان نہیں ہیں۔ اگر ماضی کے پرستار نہیں ہیں، اگر محدود معلومات کے لوگ نہیں، اگر عصبیت کا شکار نہیں ہیں تو وہ بڑی بڑی سیاسی انجمنوں سے زیادہ کارآمد ہیں، وہ بڑی بڑی مذہبی اور اصلاح پسند جماعتوں سے زیادہ مفید ہیں۔

اسوقت میں آپ کا کچھ وقت یہ بتانے میں لینا چاہتا ہوں کہ صرف ادب اور ادب کے پرستار ہی وہ کام

---

[1] یہ مضمون انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری ہندوستانی کانفرنس میں پڑھا گیا۔

کر سکتے ہیں جو کوئی اور جماعت نہیں کر سکتی - ایک سیاست دانوں کی انجمن ملکی مفاد، طبقات کی جنگ اور اُن ذاتی مسائل پر غور کرے گی جن کا تعلق کسی ایک خاص جماعت یا زیادہ سے زیادہ کسی ایک خاص ملک سے ہے۔ وہاں وطن پرستی کا اتنا جوش ہوتا ہے کہ دوسرے ملکوں کے انسان انسان ہی نہیں معلوم ہوتے - جاپان بدھ مذہب کے فلسفہ کا قائل ہونے کے باوجود، اہمسا کے اُصول کا مدعی بن کر، اپنی روزانہ کی زندگی میں قابلِ قدر انسانی دوستی دکھا کر بھی چین میں بسنے والوں کے خون سے کھیل سکتا ہے۔ ملکی سیاستیں قومیت اور وطنیت کے محدود تخیل کا شکار ہیں۔ اُن کو انسانوں سے ہمدردی نہیں بلکہ اپنے ملک سے ہمدردی ہے اور اپنے ملک میں بھی صرف اُن لوگوں سے جو ایک خاص طرح سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ہٹلر کے جرمنی میں یہودیوں کو کوئی جگہ اس لئے نہیں مل سکتی کہ وہ نازیت کے ماننے والے نہیں ہیں، اُن کی رگوں میں وہ سُرخ خون نہیں ہے جو آریہ نسل کے جرمن باشندوں کے لئے ضروری ہے۔

یہی حال اُن انجمنوں کا ہے جن کی بنیاد مذہب پر ہے۔ چونکہ اُن کے یہاں کسی ایک خاص مذہب یا مسلک کے متعلق برتری کا خیال قایم کر لیا جاتا ہے اس لئے وہ بھی اختلافات کی جانب تیزی سے رہنمائی کرتی ہیں اور وحدتِ انسانیت کا وہ خواب جو ہمیشہ دنیا کے بڑے بڑے سوچنے والوں نے دیکھا ہے کبھی پورا نہیں ہوتا۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مذہبی انجمنیں اور محدود ملکی سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والی جماعتیں سماج کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کا اندازہ نہیں لگاتیں بلکہ دنیا کو اپنے تیار کئے ہوئے سانچے میں ڈھالنا چاہتی ہیں لیکن اس کے برعکس ادبی مصنفین کا ایک ایسا گروہ جو درحقیقت انسانوں کی مادی اور روحانی ضرورتوں کا احساس رکھتا ہے، ان محدود اور گھرے ہوئے تصورات سے بہت آگے جاتا ہے۔ وہ تمام انسانوں کے عام جذبات کی ترجمانی کر کے، عوام میں نئی صلاحیتیں اور نئی قوتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ ایسے سوچنے والوں اور لکھنے والوں کا گروہ ہوتا ہے جس کے سامنے ہندوستان کے عوام، روس کے عوام یا امریکہ کے عوام نہیں ہوتے بلکہ تمام دنیا کے انسان ہوتے ہیں۔ ادیب ساری دنیا کے لوگوں کے محسوسات میں سے وہ مشترک جذبات تلاش کر لیتا ہے جس کے اثر سے کائنات لرز رہی ہے۔ اس لئے میں نے پہلے کہا ہے کہ ادیبوں سے ہم کو جو امید ہو سکتی ہے وہ کسی سیاسی انجمن سے ممکن نہیں۔ لیگ آف نیشنز (League of Nations) کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ ابی سینیا پر اٹلی کا قبضہ دیکھ کر ایک بزدل کتے کی طرح بھونک بھونک کر خاموش ہو جائے مگر ایک سچا ادیب، ایک ترقی پسند لکھنے والا اسکے خلاف سب سے پہلے آواز اُٹھائے گا کیونکہ یہ غلامی انسانیت کی توہین ہے۔ جنرل فرینکو اور اسپینی جمہوریت پسندوں کی لڑائی میں "کمیٹی عدم مداخلت" (Non-Intervention Committee) دھمکیاں دیدیکر اور سیاسی بازی گری دکھا دکھا کر رہ جائے مگر ایک ادیب اسے خاموشی سے نہیں دیکھ سکتا۔ ایسی مثالیں آپ کو

بہت ملیں گی کہ جب وطن اور مذہب کے اجارہ دار ظلم و جور کی دراز دستیوں پر سر جھکائے ہوئے بیٹھے تھے تو ادیبوں نے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ میں پھر دُہراتا ہوں کہ ترقی پسند ادیبوں کی ایک بین الاقوامی انجمن وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو کسی اور سے ممکن نہ ہو سکا ـــــ دوسرے الفاظ میں اسے یوں سمجھئے کہ ہمیں ایک عالمگیر ادب چاہئے یہ نہ سوچئے کہ اسکے لئے ایک عالمگیر زبان کی ضرورت ہو بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ ہر کتاب کو اُن خیالات اور جذبات، اُن ارادوں اور اُن مقاصد کا آئینہ دار ہونا چاہئے جو تمام بنی نوع انسان کی ملک ہیں۔ ہر کتاب میں انسانوں کی وہ پاکیزہ آرزو شامل ہونی چاہئے جو آزادی حاصل کرنے کے لئے بیچین ہے۔ زندگی جن تکالیف سے بھری ہوئی ہے اور سماج اور قانون نے جو پابندیاں ہم پر عاید کر دی ہیں اُن سے نفرت ہر انسان کے سینہ میں کسی نہ کسی وقت ظاہر ہوتی ہے، اُصولِ زندگی کے بلند تر نظریوں کے حاصل کرنے کا شوق ہر ترقی پسند انسان کے یہاں پیدا ہوتا ہے اس لئے عالمگیر ادب وہی ہے جو ان تمام جذبات کو اپنے یہاں جگہ دے جو ساری دنیا کے آدمیوں کو اپنی نظر کے سامنے رکھے، جب وہ کچھ پیش کرے تو کسی ایک ملک کے انسانوں کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے اُن تمام انسانوں کے لئے جو زندگی کی مصیبتوں سے جنگ کر کے ان پر فتح حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس وقت ہم دُور دُور کی باتوں کو نظر انداز کر کے اپنا دائرۂ خیال چھوٹا کر دیں تو صاف الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں زیادہ تر اُن موضوعات پر لکھنا چاہئے جن میں دنیا کے تمام انسان ضروریات اور جذبات کے لحاظ سے مشترک ہیں۔ دنیا کے کس حصہ کے باشندے ہیں جو بھوک لگنے پر بھوک سے بیچین نہیں ہوتے؟ کون غریب ہے جو سرمایہ دار کے مظالم سے پریشان نہیں ہو جاتا؟ کون شخص ہے جو سماج اور قانون کی بیجا پابندیوں سے گھبرا کر چیخ نہیں اُٹھتا؟ کون غلام ملک ہے جو زنجیروں کا بوجھ محسوس کر کے اُسے توڑنے کی کوشش نہیں کرتا۔؟ یہ وہ مشترک جذبات ہیں جو کسی ملک تک محدود نہیں بلکہ ہر جگہ موجود ہیں۔ جہاں ایسی فضا پیدا ہو جائے وہاں ادیبوں کا فرض ہے کہ صرف انھیں موضوعات کا انتخاب کریں جو دبے ہوئے طبقہ سے اتنی ہمدردی پر مبنی ہوں کہ وہ اپنے دبانے والوں سے بغاوت پر آمادہ ہو جائیں۔ اگر ادیب نے ایسا نہیں کیا تو اُس نے وہ خدمت ہی انجام نہیں دی جس کی اُس سے امید ہے۔

ہمارے ذاتی اور ملکی اختلافات کتنے ہی ہوں، ہمارے طرزِ معاشرت میں ایک دوسرے سے کتنا ہی فرق ہو ہمارے مذہبی اختلافات کی خلیج کتنی ہی وسیع ہو، ہمارے صدیوں کے جھگڑوں نے کوئی شکل اختیار کر لی ہو مگر ادب کا فرض ہے کہ ان تمام چیزوں سے بلند ہو کر، تمام انسانوں کی زندگی میں وہ مرکزی اور بنیادی مناسبت تلاش کرے جس سے کوئی ملک اور کوئی طبقہ خالی نہیں۔ جس روز ادب نے اتنی وسعت اختیار کر لی وہی دن انسانیت کی فتحمندی کا دن ہوگا۔ ادب ہمارے خیال اور شعور میں گہرائی پیدا کر کے، ہمارے احساسات کو انسانی ہمدردی کے سانچہ میں ڈھال کر ہمارے دلوں میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ ساری دنیا انسانوں کی ہے، یہ انسانوں کے خون اور

گوشت سے بنی ہے اور انسان اس کی مٹی اور نباتات سے پیدا ہوئے ہیں۔ میکسم گورکی ایک موقعہ پر تمام دنیا کے انسانوں کو ایک بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ "ادب ہم سے بتاتا ہے کہ چین کا رہنے والا ہن ٹوائے (Hen Joy) عشق و محبت میں گرفتار ہو کر اُسی کرب اور بے چینی کا شکار ہے جیسے ہسپانوی ڈان جوآن (Don Juan)، ایک حبشی عاشق رنج و مسرت کے وہی گیت گاتا ہے جو ایک فرانسیسی عاشق، مینن لسکاٹ اور ایک جاپانی رقاصہ کی محبت میں ایک ہی سا درد ہوتا ہے۔ ایشیا میں بھی ایک خونی اسی طرح قابل نفرت ہے جیسے یورپ میں ------ ہر ملک میں مذہبی ریاکاروں کی کیفیت ایک سی ہے — زندگی کے وہ بے رحم اختلافات جو افراد، طبقات یا اقوام میں دشمنی اور نفرت کا بیج بوتے ہیں ادب کے نزدیک صرف ایک پرانی غلطی پر مبنی ہیں۔ انسانوں کے شریف ارادے ایسی غلطیوں کو مٹا سکتے ہیں"

ادب پر سرمایہ پرستوں کا قبضہ نہیں ہونا چاہئے۔ ادب کو کسی طبقہ کی ملک نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اُسکو ساری دنیا کے لئے لکھنا ہے۔ اُس کا مقصد ہی یہی ہے کہ وہ قوموں، ملکوں اور جماعتوں کے باہمی جھگڑوں کو ہمیشہ کے لئے مٹا دے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان ایک غیر تعلیم یافتہ ملک ہے اور یہ کمی ترقی پسند ادیبوں کے ارادوں میں روڑے اٹکائے گی مگر اس خیال سے یہ شریف ارادہ ہی ترک کر دینا ہمت کی کمی کا اظہار کرتا ہے۔

ہم کو تمام دنیا کے انسانوں کو ایک کرنے پر لگ جانا چاہئے کیونکہ ہم جتنی دیر کرتے جائیں گے وہ خوشنما مستقبل ہم سے دور ہوتا جائے گا جس کے ہم آرزومند ہیں۔ امریکہ کی (International Historical Society) انٹرنیشنل ہسٹاریکل سوسائٹی نے کوئی تین سال ہوئے ایک سوال شایع کیا تھا کہ آنے والی دُنیا کو پُر امن بنانے کے لئے دنیا کے نوجوان کیا کر سکتے ہیں؟ یورپ اور امریکہ کی بہت سی یونیورسٹیوں کے طلبا نے جوابات بھیجے تھے۔ بلغاریہ کے کسی طالب علم نے لکھا تھا کہ ہمیں یعنی نوجوانوں کو کسی شہنشاہی جنگ میں حصہ لینے اور فوجوں میں بھرتی ہونے سے انکار کر دینا چاہئے۔ یہ جواب اس وسیع انسانی تصور پر مبنی ہے جس کا ذکر میں کر رہا ہوں۔ دنیا کا مستقبل خوشگوار بنانے کے لئے اسی طرح کے مضبوط ارادوں کی ضرورت ہے اور اگر ساری دنیا کے ادیب دنیا کو ترقی کے راستہ پر لگانے کا اسی طرح ارادہ کر لیں تو انسان، انسان کو غلام نہ بنائے، سرمایہ دار مزدور کا خون نہ چوسے، سماج کے ٹھیکہ دار وہ مظالم روا نہ رکھیں جنھیں وہ اپنا حق سمجھے ہوئے ہیں۔

میکسم گورکی، آگے بڑھکر ایک جگہ پر پھر لکھتا ہے کہ:- "اس موجودہ دور میں جب انسانی برادری اور سماجی اشتمالیت کا خیال کھلے طور پر حقیقت اور ضرورت میں تبدیل ہو رہا ہے ہم پر فرض ہے کہ ہم اس کوشش

میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں کہ عالمگیر اخوت کا صحت بخش خیال پوری سرعت سے تکمیل کو پہونچ کر عوام کے دل و دماغ میں داخل ہو جائے۔"

عزیز دوستو! آج یہیں یہ مستقل عزم کر لو کہ جو کچھ لکھو گے وہ انسانیت کو اُبھارنے کے لئے لکھو گے، غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے لکھو گے، اُن تمام زنجیروں کے توڑنے کے لئے لکھو گے جو ترقی کی طرف جانے سے روکتی ہیں۔ پھر تمھیں خود نظر آئے گا کہ آج کی دنیا جو افلاس، بھوک، بیکاری اور غلامی سے کراہ رہی ہے کس طرح امن و سکون کا گھر بن جاتی ہے!

احتشام رضوی ماہلی ایم۔اے

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علٰحدہ علٰحدہ خرید فرمائیں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر سہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نو روپیہ

معرکۂ سخن	مکتوبات نیاز	اُردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے

منیجر نگار لکھنؤ

فنِ خطابت اور اہلِ عرب

ملکۂ تقریر و تحریر نے تہذیب و تمدن کی دنیا میں ہمیشہ بڑے بڑے انقلاب پیدا کئے ہیں اور ترقی علوم و فنون بڑی حد تک اس کی ممنون ہے

خطابت عربوں کے مایۂ ناز فنون میں سے ہے اور دنیا میں مشکل سے کوئی قوم اس باب میں ان کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ عرب اگرچہ جاہل تھے لیکن وہ فطری طور پر بڑے زباں آور اور فصیح البیان واقع ہوئے تھے، قدرت نے اُن کو جذبات اور مدرکات کے اظہار پر ایسی قوت عطا فرمائی تھی جس کی مثال اُس زمانہ کی بڑی سی بڑی شائستہ و متمدن قوم میں نہیں ملسکتی

زبان کا اُن کو فطرتاً ذوق تھا، ہر طرف سخن سنجی اور سخن فہمی کا بازار گرم تھا، اُن کے کسی قبیلہ میں جب کوئی نیا شاعر یا خطیب پیدا ہوتا تھا تو ہر طرف سے مبارکباد کے پیغام پہونچتے تھے عورتیں رقص و سرود کے جلسے کرتی تھیں اور سارے قبیلہ میں خوشیاں منائی جاتی تھیں

زبان اور اُسکی تدریجی ترقی

جس طرح قوم کی زندگی کے ارکان، مذہب، علوم، عادات و اخلاق، رسم و رواج وغیرہ ہیں اُسی طرح زبان بھی ہے

جب سے انسان ہے اُسی وقت سے زبان بھی پائی جاتی ہے، انسان کی آبادی جس قدر زمین کے وسیع رقبہ میں پھیلتی گئی اُس کی زبان بھی وسیع ہوتی گئی اور ایک دوسرے سے مختلف تا اینکہ اب بے شمار زبانیں نظر آتی ہیں۔

ابتدا میں کونسی زبان رائج تھی اس کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا جاسکتا، ہر زبان کا حامی یہ ثابت کرنیکی کوشش کرتا ہے کہ اُسی کی زبان "اُم الالسنہ" ہے لیکن فیصلہ دشوار ہے۔

مذہبی طبقہ کا خیال ہے کہ زبان کی پیدائش "منجانب اللہ" ہے، افلاطون، ابن فارس اور علماء اشعریہ کا بھی یہی مذہب ہے مگر دوسرے گروہ کا یہ خیال ہے کہ زبان الہامی نہیں بلکہ وضعی ہے، یہ ابوعلی فارسی، ابن جنی اور علماء معتزلین کی رائے ہے

حامیان نظریۂ ارتقاء کا بھی یہی خیال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح جانور حرکتوں اور اشاروں کے ذریعہ سے

ایک دوسرے کا مطلب سمجھ لیتے ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح انسان ابتداءً اشاروں اور مختلف حرکتوں سے اپنا مافی الضمیر ظاہر کرتا تھا، پھر رفتہ رفتہ جب اُس نے ترقی کی تو وہی اشارے "آواز" میں اور پھر آواز "الفاظ" میں تبدیل ہوئی یہاں تک کہ انھیں الفاظ سے باقاعدہ زبان پیدا ہوگئی اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے

عربی زبان کی مختصر تاریخ دنیا کے انقلابات کی وجہ سے عربی زبان نے بھی بڑے بڑے پلٹے کھائے، چنانچہ اگر موجودہ عربی زبان کا، زمانۂ جاہلیت کی زبان سے مقابلہ کیا جائے تو بڑا فرق نظر آئے گا۔ اسلام سے قبل چونکہ عربوں میں تصنیف و تالیف کا رواج نہ تھا اس لئے زبان عربی کی تاریخ آفرینش کا پتہ نہیں چلتا اور نہ یہ صحیح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس زبان سے نکلی ہے

اس زبان کی تدوین کا خیال سب سے پہلے حضرت علی کو پیدا ہوا، وجہ یہ ہوئی کہ اسلام کی کثرت فتوحات نے جب تمام دنیا پر اپنا سکہ بٹھا دیا اور عرب و عجم میں ارتباط کے نئے نئے سامان پیدا ہوئے تو اُس کا اثر زبان پر بھی پڑا اور لوگوں کو اس بات کا اندیشہ پیدا ہوا کہ عربی زبان بہت جلد مختلف زبانوں کی آمیزش سے بگڑ کر ایک نئی صورت اختیار کرے گی۔ اس موقع پر حضرت علیؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے تتبع اور استقراء سے چند قواعد لکھے اور ابو الاسود دوئلی کو حکم دیا کہ وہ اسی نہج پر عربی زبان کے قواعد کی تدوین کریں چنانچہ انھوں نے اس مہتم بالشان کام کا آغاز کیا اور اسی بنیاد پر بعد کو اور عمارتیں کھڑی کی گئیں

بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں جوں جوں علوم و فنون مدون ہوتے گئے اُسی قدر زبان بھی ترقی کرتی گئی، دوسری زبانوں سے منطق، فلسفہ، ریاضی اور ہیئت وغیرہ کی کتابوں کے ترجمے کئے گئے، اُن کی اصطلاحات اور اُن کے مطالب ادا کرنے کے لئے دوسری زبانوں سے الفاظ مستعار لئے گئے، انتظام ملکی اور نظم و نسق سلطنت کے لئے نئے نئے عہدے اور مناصب قایم کرنے پڑے جن کے متعلق بہت سے الفاظ کا اضافہ ہوا

گزشتہ صدی کے وسط میں جو انقلاب عربی زبان پر آیا وہ پچھلے انقلابات سے کم نہ تھا، مصر و شام میں علوم جدیدہ کا سیلاب اس زور سے آیا کہ کسی کو اتنی فرصت بھی نہ ملی کہ اُن کے لئے اصطلاحات علمیہ وضع کر لیتے اس لئے انگریزی جرمنی، فرانسیسی اصطلاحات کے بہت سے الفاظ عربی زبان میں داخل ہوگئے

اس زمانہ میں عربی زبان کے اندر جو اضافہ ہوا وہ دو قسم کا ہے، ایک تو وہ جو دوسری زبان سے عربی میں داخل ہوئے جیسے تلغراف، بنطلون، پروجرام، وابور، فونوغراف وغیرہ دوسرے وہ جو علوم جدیدہ، نئے آلات و ایجادات کے لئے خود زبان عربی کے الفاظ ان معانی کے مقابلہ میں پیدا ہوگئے، جیسے جریدہ، مجلہ، مدیر، کلیۃ، رسمیۃ اور وسام وغیرہ۔

خطابت کی تعریف خطابت ایک طبعی چیز ہے، انسان ابتدائے آفرینش سے اپنے تمدنی و معاشرتی ضروریات

کے سمجھنے اور سمجھانے میں اپنا مافی الضمیر زبان سے ادا کرنے پر مجبور ہے، لغوی معنے کے اعتبار سے ہر ایسے کلام کو جو دوسروں کو سمجھانے کے لئے کیا جائے "خطابت" کہتے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں اُس فن کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ ایک خطیب اپنی تقریر کو کن طریقوں سے موثر بنا سکتا ہے اور اپنے دعویٰ کو کس طرح سامعین کے دلوں پر بٹھا سکتا ہے، علامہ "ابن رشد" نے اپنی کتاب "تلخیص الخطابۃ" میں اُسکی تعریف کی ہے کہ:۔ "خطابت اور خطاب لغت میں اُس کلام کو کہتے ہیں جو دوسروں کو سمجھانے کے لئے کیا جائے مگر حکماء کی اصطلاح میں اُس فن کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے دوسروں کو تمام اصناف کلام میں حتی الامکان مطمئن کیا جا سکے"

علامہ "ابن اثیر" نے اپنی کتاب "المثل السائر" میں بیان کیا ہے کہ ہر شخص کسی علم کو پڑھکر اپنے آپ کو اُس علم کی طرف منسوب کر سکتا ہے، لیکن ایک شخص خطیب و کاتب اُسوقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ تمام علوم پر حاوی نہ ہو، اس فن کا موضوع کوئی خاص چیز نہیں کوئی چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ اور بڑے سے بڑا قضیہ ایسا نہیں جو اُسکے وسیع دائرۂ علم سے خارج ہو، کوئی ذہنی یا محسوس چیز ایسی نہیں جس پر خطابت کا زور نہ چلتا ہو، اس لئے ضروری ہے کہ خطیب کا دماغ ہر قسم کے معلومات کا خزینہ ہو

خطابت و صحافت کا فرق

قوت گویائی سب لوگوں میں یکساں نہیں پائی جاتی، کسی میں یہ قوت زیادہ ہوتی ہے اور کسی میں کم، بعض لوگ فطرتاً فصیح البیان اور زباں آور ہوتے ہیں اور بعض معمولی سی معمولی بات بھی ادا نہیں کر سکتے مگر اچھے انشاء پرداز ہوتے ہیں، بعض محض خوش تقریر ہوتے ہیں مگر قوت صحافت ان میں بالکل مفقود ہوتی ہے، بعض ایسے ہوتے ہیں جن میں تقریر و تحریر دونوں صفتوں میں سے کوئی صفت نہیں پائی جاتی اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کو ان دونوں میں کافی ملکہ حاصل ہوتا ہے

علامہ ابو ہلال عسکری نے اصناف رجال کی اسی تفصیل کو بتاتے ہوئے خطیب کو مندرجۂ ذیل اُصول پر عمل پیرا ہونے کی تاکید کی ہے:۔

"جو شخص اچھی تقریر نہ کر سکتا ہو اس کے لئے خاموش رہنا زیادہ بہتر ہے، لیکن جو شخص خوش بیان ہو، اس کو اعتدال اختیار کرنا چاہیئے، کیونکہ طوالت بیان لوگوں کو مکدر کر دیتی ہے اور لمبی چوڑی تقریریں کرنے والے بہت کم ایسے ہیں جو لغزشوں سے محفوظ رہیں" (کتاب الصناعتین صفحہ ۱۵)

اسباب خطابت

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں میں مندرجۂ ذیل وجوہ کی بنا پر خطابت کا بہت زور و شور تھا۔

۱۔ عرب زیادہ تر ناخواندہ تھے اس لئے لازمی طور پر بجائے تحریر کے تقریر اُن کے لئے زیادہ مفید و کارآمد تھی۔

۲- عرب فطرتاً فصیح و بلیغ اور بڑے زبان آور تھے قومی اور ملکی نظم و نسق میں جب اُنھیں ضرورت پیش آتی تو وہ فوراً تقریر سے کام لیتے تھے

۳- عرب پہلے چھوٹے چھوٹے قبیلوں اور جماعتوں کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے تھے اس لئے تقریر کے موقع پر وہ آسانی سے ایک جگہ جمع ہو جایا کرتے تھے،

۴- عرب میں پہلے ڈاک وغیرہ کا سلسلہ نہ تھا اس لئے دور دراز مقامات پر پیغامات وغیرہ بھیجنے کے لئے وفود بھیجے جاتے تھے جس میں رئیس الوفد عموماً تقریر کے ذریعہ سے لوگوں کو پیغامات پہونچاتا تھا

۵- عربوں میں کشت و خون کا بازار ہمیشہ گرم رہتا تھا، ان موقعوں پر جوش و ہمت دلانے کے لئے تقریر کرنے والے کی سخت ضرورت ہوا کرتی تھی

آداب خطابت

لوگوں کو کسی حقیقت کے سمجھانے اور کسی مسئلہ کے متعلق مطمئن کرنے کے لئے ایک خطیب کو اپنے خطبہ میں جن باتوں کے ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ مندرجۂ ذیل ہیں:-

(۱) خطیب کے لئے بہت ضروری ہے کہ وہ موقع و محل کو اچھی طرح سمجھ لے کہ یہاں کس قسم کے لوگ جمع ہیں؟ اُن کے طبائع کا میلان کس طرف ہے؟ اُن کے خاص خاص جذبات و احساسات کیا ہیں؟ اُن کو کن کن طریقوں سے بیدار کیا جا سکتا ہے؟ کبھی وہ اپنے مقصد پر تجویز کی روشنی ڈالے اور موثر پیرایہ میں سامعین کے مردہ جذبات کو برانگیختہ کرے اور کبھی جرح و قدح، زجر و توبیخ کے پہلو سے ان کے احساسات کو ٹھیس لگائے۔

قوم و ملک میں سیاسی زندگی اور قومی روح پیدا کرنی ہو تو خطیب کو سیاست اور قومی روایات سے بخوبی واقف ہونا چاہئے تاکہ وہ سمجھ سکے کہ قوم اور ملک کے احساسات اور جذبات کیونکر برانگیختہ کئے جا سکتے ہیں؟ اُن کے دلوں میں قوم پرستی، حب وطن کے شریف جذبات کیونکر راسخ کئے جا سکتے ہیں؟ اُس کے موثر طریقے کیا ہیں؟ اور اُن کو کیونکر کام میں لانا چاہئے؟

انسان چونکہ فطرتاً تقلید پرست واقع ہوا ہے اس لئے اُس کے اخلاق و عادات کو اپنی جگہ سے ہٹانا کچھ آسان کام نہیں، قومی روایات اور قومی سرمایہ کی حفاظت کا انسان کو سب سے زیادہ خیال ہوتا ہے، یہانتک کہ وہ اُن لوگوں سے لڑنے مرنے پر تُل جاتا ہے جو اُس کے قومی روایات میں کوئی تغیر یا ترمیم کرنا چاہتے ہیں۔

ہر زمانہ اور ہر قوم کے سیاست داں حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو سب سے زیادہ آزاد پسند ہوتے ہیں اپنی اپنی قوموں کے تخیلات و اعتقادات کا ہمیشہ احترام کرتے ہیں اور حتی الامکان اُن کے خلاف عمل پیرا ہونے سے گریز کرتے ہیں، اُن کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ وہ لوگوں کے خیالات و اعتقادات کو پس پشت ڈال کر فرض قیادت انجام دے سکیں گے، اگر وہ ایسا کریں تو ان کی ساری عزت خاک میں مل کر رہ جائے، یہی وہ چیز ہے جو

جو زمانہ کے خطباء اور انسانی فطرت کے نبض شناسوں نے ہمیشہ قومی جذبات کے مشتعل کرنے میں پیش نظر رکھی ہے۔

(۲) خطیب کو بہادر اور بلند آواز کا ہونا چاہئے، اُس کو چاہئے کہ وہ اپنا انداز بیان مدعیانہ اور متحکمانہ رکھے، جو کچھ بیان کرنا ہو پورے وثوق اور انتہائی قطعیت کے ساتھ کہے، اگر اُسے کسی عقیدہ کو سامعین کے دلوں میں راسخ کرنا ہے تو اُس کو چاہئے کہ وہ اپنا عقیدہ سننے والوں پر اس طرح ظاہر کرے کہ وہ خود اُس کا حد درجہ یقین رکھتا ہے۔ "شاید" "غالباً" "ممکن ہے" اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ جن سے مقرر کا شک وشبہ ظاہر ہوتا ہو، دعویٰ کی قوت کو ضعیف کر دیتے ہیں

اسی طرح اپنے دعوے کو دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرنا ہی سامعین کو اس بات کی دعوت دینا ہے کہ وہ محل نقد و نظر ہیں اور ظاہر ہے کہ نظریات خواہ کتنے ہی قوی ہوں بدیہیات کا مقابلہ نہیں کر سکتے

مقرر اپنے خیالات کے اظہار میں شک و تذبذب کے الفاظ اور عقلی دلایل و براہین سے جتنا زیادہ گریز کرے گا اُسی قدر اپنی تقریر میں زیادہ کامیاب ہوگا، دنیا کے بڑے بڑے سیاست داں اور بانیان مذاہب جب کسی قوم کے احساسات کو برانگیختہ کرنا چاہتے ہیں یا کسی عقیدہ کو رواج دینا چاہتے ہیں تو ہمیشہ اسی مدعیانہ طرز بیان کا خیال رکھتے ہیں

آنحضرت صلعم کے رضاعی باپ حضرت حلیمہ کے شوہر جب مکہ تشریف لائے تو قریش نے کہا "کچھ سنا ہے تمہارا بیٹا کہتا ہے کہ لوگوں کو مر مر کر پھر جینا ہوگا" انھوں نے آنحضرت صلعم سے پوچھا، آپ نے نہایت پرجوش لہجہ میں فرمایا "اگر وہ دن آیا تو میں آپ کا ہاتھ پکڑ کر بتا دوں گا کہ جو کچھ میں کہتا تھا سچ تھا" یہ سُنکر وہ فوراً مسلمان ہو گئے، ان فقروں کا اثر اُن پر عمر بھر رہا، وہ کہا کرتے تھے کہ "میرا بیٹا میرا ہاتھ پکڑ کر جنت میں پہونچائے گا"[1]

اسی طرح جب کفار قریش نے آکر حضرت ابوطالب سے شکایت کی "کہ اب تک ہم آپ کا خیال کرتے رہے اب معاملہ حد سے تجاوز کر چکا ہے، محمد ہمارے بتوں کو بُرا بھلا کہتے ہیں اور ہم کو اُن کی عبادت سے روکتے ہیں یا تو آپ اُنھیں روک دیجئے یا خود بیچ سے علٰحدہ ہو جائیے تاکہ ہم اور وہ آپس میں نپٹ لیں" حضرت ابوطالب نے سرور عالم صلعم کو بلا کر فرمایا "اے برادر زادے! مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈال جو میری طاقت سے باہر ہو" آنحضرت نے اُسوقت ایک پرجوش وقار اور پرعظمت اولوالعزمی کے ساتھ فرمایا:-

یا عم! واللہ لو وضعوا الشمس فی یمینی	چچا جان! خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں آفتاب

[1] اصابہ تذکرۂ حارث ج ۱۲

والقمرنی یساری علی ان اترک ہذا الامر، ماترکتہ، حتی یظہر اللہ تعالیٰ او اُھلک فیہ

اور بائیں میں ماہتاب لاکر رکھدیں تاکہ اس فریضہ کی تبلیغ سے باز آجاؤں تب بھی میں نہ چھوڑونگا تاوقتیکہ خدا اپنے دین کو سب پر غالب کرے یا میں اسی کوشش میں قربان نہ ہوجاؤں۔

(سیرت حلبیہ جلد اول صفحہ ۲۸۷)

حضرت ابوطالب پر اس جواب کا بڑا اثر ہوا انھوں نے ایک پر ہیبت لہجہ میں فرمایا۔ "جاؤ تمھارا جو جی چاہے کرو، خدا کی قسم میں تمھیں کسی حالت میں کفار کے سپرد نہ کروں گا" اور پھر یہ شعر پڑھا:۔

واللہ لن یصلوا الیک بجمعہم حتیٰ اوسد فی التراب دفینا

خدا کی قسم وہ تمھاری طرف ہرگز نہیں پہونچ سکتے جب تک کہ میں مٹی میں نہ ملا دیا جاؤں

(۳) خطیب کو چاہیئے کہ حتی الامکان اپنے مافی الضمیر کو ایسے سادہ مثالوں اور تشبیہات کے ذریعہ سے ظاہر کرے جو سامعین کے سامنے اُس کا ایک موثر نقشہ کھینچ دیں ورنہ تقریر گو کتنی ہی بلیغ ہو سامعین پر اُسکا خاک اثر نہ ہوگا۔

اس عنوان کے ماتحت علامہ جاحظ اور ابوہلال عسکری نے بہت سے دلچسپ قصے لکھے ہیں جن میں سے ایک درج ذیل ہے:۔

ابوعلقمہ نحوی مشکل اور مغلق الفاظ بولنے کا عادی تھا، اُس پر کبھی کبھی مرگی کا دورہ ہوا کرتا تھا ایک مرتبہ وہ بصرہ میں کسی سڑک پر جارہا تھا کہ یک بیک اُس پر دورہ پڑا، اور وہ سڑک کے کنارہ گر پڑا، لوگ اُس کے چاروں طرف جمع ہوگئے اور اُس کے کانوں میں اذان دینے لگے۔ جب اُس کو ہوش آیا تو وہ یہ کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

مالکم تکاکئون علیّ کانکم تکاکئون علی ذی جنّۃٍ افرنقعوا عنّی

تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ تم مرے پاس اس طرح جمع ہوگئے جیسے لوگ آسیب زدہ کے پاس جمع ہوتے ہیں مرے پاس سے چلے جاؤ

(کتاب البیان والتبیین جزء اول صفحہ ۲۰۲)

(۴) خطیب کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ خطبہ دیتے وقت اس بات کا خاص طور سے خیال رکھے کہ لوگ اُسکی تقریر سننے سے اُکتا نہ جائیں کیونکہ جب سامعین کسی تقریر سے اُکتا جاتے ہیں تو مقرر خواہ کیسے ہی خطیبانہ پیرایہ میں تقریر کررہا ہو، اس کی آواز پر کان نہیں دھرتے۔

ایک ماہر علم موسیقی کی خوش الحانی اُسی وقت تک لطف دیتی ہے جب تک وہ ایک خاص حد میں رہے حد سے بڑھ جانے کے بعد وہی ترنم ریز آواز جو پہلے دلکش اور بھلی معلوم ہوتی تھی کانوں کو گراں اور ناگوار گزرنے لگتی ہے۔

ایجاز و اختصار بلاغت کی جان ہے، طوالت بیان بذات خود کلام کے اثر کو گھٹا دینے والی چیز ہے، مثلیں،

کہاوتیں اور مقولات جو زبان زد عوام ہوتے ہیں اُن کی خصوصیت مشترکہ یہ ہوتی ہے کہ اُن کا مفہوم وسیع ہوتا ہے لیکن الفاظ کا شمار بہت ہی محدود۔

جس چیز کو علمار ادب "آمد" سے تعبیر کرتے ہیں اُس کا اہم جز اختصار ہے، طوالت بیانی میں ہمیشہ آورد اور تصنع کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایجاز میں جو سحر ہوتا ہے وہ تطویل میں قائم نہیں رہ سکتا۔

(۵) خطیب کو اپنے حرکات وسکنات کا بھی بہت خیال رکھنا چاہئے، مثلاً اُس کی آواز معتدل ہو یعنی نہ اتنی پست ہو جس کو لوگ سُن نہ سکیں، نہ اتنی بلند اور کرخت جس سے لوگ نفرت کریں، زبان صاف اور شستہ ہو، دل قوی اور مضبوط ہو، تقریر کرتے وقت اُس کے ہاتھ پاؤں نہ کانپیں، آواز میں رعشہ پیدا نہ ہو، چہرے کی رنگت نہ بدلے، دل میں دھڑکن ہوتی ہو نہ داڑھی میں بار بار کھجلی

روزمرہ کا تجربہ ہے کہ جب ہم ایک خاص طرز سے اپنے بعض اعضار جسم میں تغیرات پیدا کر لیتے ہیں تو بغیر کسی ہیچ خارجی کے اُن آثار جسمانی کے تناسب ایک احساسی کیفیت از خود پیدا ہو جاتی ہے، تھیٹر اور سینما میں کام کرنے والے وہ ایکٹر اور ایکٹرس جو جذبات کی تصویر حرکات وسکنات کے ذریعہ سے پیش کرتے ہیں اور اُن جذبات وکیفیات کو واقعتاً اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں وہی اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔

مثلاً کوئی شخص اپنی زبان اور جسمانی نقل وحرکت سے دلیری اور بہادری کا نمونہ دکھانا چاہتا ہے یا کسی بے کس اور غم زدہ کا پارٹ کرنا چاہتا ہے تو اُن جذبات کے ادا کرنے میں وہ ایکٹر زیادہ کامیاب ثابت ہوگا جس کے دل میں واقعی تھوڑی دیر کے لئے شجاعت، جوانمردی یا غم والم کی کیفیت پیدا ہو جائے

کسی جادو بیان مقرر کی تقریر میں جس طرح اُس کے الفاظ تیر ونشتر بنکر دل میں اُترتے ہیں، ٹھیک اُسی طرح اُس کی آواز، حرکات وسکنات، اشارات وکنایات کا بھی اثر پڑتا ہے، کلام پر زور دینے کے لئے ہاتھوں سے اشارہ کرنا جوش کے موقعوں پر مٹھیاں بند کر کے زور سے ہاتھوں کو ہلانا عموماً ہر مقرر میں پایا جاتا ہے

زمانۂ قدیم سے فن خطابت میں اشاروں کے استعمال پر بھی زور دیا جا رہا ہے اور آج بھی اس فن کی جہاں باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے، وہاں انتخاب الفاظ اور اُس کے آثار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ اشاروں کے استعمال کی بھی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے

انھیں باتوں کو علامہ ابوہلال عسکری نے "کتاب الصناعتین" میں بالتفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اگر کسی خطیب کو دوران تقریر میں اطمینان قلب نصیب نہ ہو تو وہ دہشت اور خوف کی وجہ سے کبھی اپنے اظہار خیال میں کامیاب نہیں ہو سکتا

جب مقرر سامعین کی عظمت سے زیادہ متاثر ہو جاتا ہے تو اُس کی قوت شعور ماند پڑ جاتی ہے، قوت تحقیق و

تنقید معطل ہو جاتی ہے، غور و تحقیق کا مادہ سلب ہو جاتا ہے اور اُس کے حواس بجا اور درست نہیں رہتے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے حاضرین کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، جو کچھ سنتا ہے اُنھیں کے کانوں سے سنتا ہے یہاں تک کہ وہ گلوگرفتہ ہو جاتا ہے اور ایک لفظ بھی زبان سے نہیں ادا کر پاتا

حضرت عثمانؓ خطبۂ خلافت دینے پہلی مرتبہ جب ممبر پر تشریف لائے تو حمد و ثنا کے بعد کچھ بیان نہ کر سکے اور صرف یہ کہکر ممبر پر سے اُتر آئے۔

انّ الّذین کانا قبلی کانا یعدان لہذا المقام مقالاً، وانتم الی امامٍ عادلٍ احوج منکم الیٰ امام قائل	بیشک مجھ سے پہلے جو دو حضرات (ابوبکر اور عمر) گزرے ہیں وہ پہلے ہی سے اس جگہ کے لئے خطبے تیار کرلاتے تھے لیکن تم کو خطیب امام کے بہ نسبت عادل امام کی زیادہ ضرورت ہے۔

(کتاب الصناعتین صفحہ ۱۵)

اسی طرح خراسان میں ایک شخص بڑی آن بان اور جوش و خروش کے ساتھ خطبہ دینے کے لئے ممبر پر آیا لیکن وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا بھول گیا، اور صرف یہ شعر پڑھکر نیچے اُتر آیا۔

لئن لم اکن فیکم خطیبًا فانّنی بسیفی اذا جدّ الوغی لخطیب	اگرچہ اسوقت میں فرض خطابت تمہارے سامنے انجام نہ دے سکا۔ خیر، اُسوقت جب جنگ چھڑ جائے گی تو میں اپنی تلوار سے اس فرض کو پورا کر دوں گا۔

(کتاب الصناعتین صفحہ ۱۵)

لیکن یہی خاموشی اور گلوگرفتگی اگر خوف اور دہشت کی وجہ سے نہ ہو بلکہ جذبات کی فراوانی سے متاثر ہو کر خطیبانہ پیرائے میں ظاہر ہو تو مجمع پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے

سکندر اعظم کا جب انتقال ہوا اور جنازہ مجمع کے سامنے لایا گیا تو ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لوگ سیاہ لباس میں ملبوس، گردن جھکائے کھڑے ہوئے تھے، اُن کے دلوں پر خوف اور دہشت طاری تھی، اتنے میں اُن میں سے ایک شخص آگے بڑھا، اس نے سر اُٹھایا، گرد و پیش نظر ڈالی اور ایک سانس لی، ایسا معلوم ہوا کہ ان سیاہ پوش ماتمیوں کے نظارے نے اُس کے دل پر کوئی خاص اثر کیا اور وہ کچھ نہ کہہ سکا، کچھ دیر کے بعد اُس نے مجمع کی طرف نیم باز آنکھوں سے دیکھا، ہونٹوں کو کسی قدر جنبش ہوئی اور آہ کے ساتھ ملے جلے یونانی زبان کے کچھ الفاظ سنائی دئے جس کے مفہوم کو عرب کے مشہور شاعر ابوالعتاہیہ نے اپنے اس شعر میں نظم کیا ہے:۔

وکانت فی حیاتک لی عظاۃً وانت الیوم اوعظ منک حیاً	تیری زندگی ہمارے لئے نصیحت تھی، لیکن آج تیری موت تیری زندگی سے زیادہ ہمارے لئے باعث عبرت ہے

(کتاب الصناعتین صفحہ ۱۲)

اس متاثرانہ طرز ادا نے مجمع میں ایک عام بے چینی اور اضطراب کی لہر دوڑا دی، دیکھا تو حاضرین کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے

خطابت کی اثر اندازی

قوت گویائی خدا کی عطا کردہ نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے، اُسی کی وجہ سے انسان کو دیگر مخلوقات پر برتری حاصل ہے، وہی قوموں کے اخلاق سدھارتی ہے، عیوب کی اصلاح اور مفاسد کا سدباب کرتی ہے، وہی دلوں میں جوش و خروش، دماغوں میں ولولے اور بازوؤں میں قوت پیدا کرتی ہے، اور دم بھر میں انقلاب برپا کر دیتی ہے۔

خطباء ہمیشہ قوم و ملک کے جذبات و احساسات سے کھیلتے رہتے ہیں، وہ کبھی اپنے قطرہائے اشک کے سیلاب میں اُنھیں ڈبو دیتے ہیں اور کبھی اپنے برق صفت تبسم سے اُن کے خرمن سکون و راحت کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں، وہ کبھی اپنی پرجوش تقریروں سے قلب و روح کو تڑپاتے ہیں اور کبھی اپنی جادو بیانیوں سے ساری قوم کو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی قربانگاہ میں بھینٹ چڑھا دیتے ہیں

دراصل اثر پذیری نفس انسانی کا فطری خاصہ ہے ہم بعض چیزوں کو بسا اوقات صرف اسوجہ سے تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہی دوسروں کے بھی خیالات ہیں، خواہ یہ نفس انسانی کی کمزوری ہی کیوں نہ ہو مگر یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس خاصہ نفس کا اثر حیات اجتماعیہ پر بہت کچھ ہوتا ہے

خطباء اس صفت سے اُس وقت زیادہ فایدہ اُٹھاتے ہیں جب افرادِ قوم ایک انبوہ کی شکل میں جمع ہو جاتے ہیں اور اُن کی ذاتی رائے اور آزادی رخصت ہو جاتی ہے، پھر اُن کو اس سے بھی غرض نہیں رہتی کہ جس مقصد کے لئے وہ متاثرانہ شان سے بیتاب نظر آرہے ہیں، کس قسم کا ہے، بلکہ اسقدر مسحور ہو جاتے ہیں کہ اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کرتے اور ہر عزیز سے عزیز چیز کی قربانی کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں

شکسپیر کی روایت کے مطابق جولیس سیزر جب قتل ہو چکا تو بروٹس مع دیگر قاتلوں کے پلیٹ فارم پر آیا اور اسباب قتل پر ایک شاعرانہ تقریر کی جس کا اثر یہ ہوا کہ تمام حاضرین اُس کے ہم آہنگ ہو گئے اور سیزر کے قتل کو نہ صرف جائز بلکہ بہتر سمجھنے لگے اور بروٹس کو "محسن ملک" کے شاندار خطاب سے پکارنے لگے

بروٹس کے الفاظ ابھی ہوا ہی میں گونج رہے تھے کہ سیزر کا دوست مارک انٹونی جسے غلطی سے بروٹس اپنا دوست سمجھ رہا تھا نمودار ہوا، بروٹس پلیٹ فارم اُس کے حوالہ کر کے خود چلا گیا، انٹونی نے اپنی تقریر شروع کی جو جس قدر بلیغ تھی اُسی قدر بروٹس کے حق میں سم قاتل، اُس کی تقریر ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ حاضرین کے دلوں میں سیزر کی موافقت اور بروٹس کی مخالفت کے جذبات پیدا ہونے لگے اور تقریر کے ختم ہوتے ہوتے یہانتک نوبت پہونچ گئی کہ سارا مجمع ایک مجنونانہ جوش کے ساتھ قاتلین سیزر سے انتقام لینے کے لئے بے خود ہو گیا اور

وہی لوگ جو چند منٹ پہلے بروٹس کو ملک کا سب سے بڑا "محسن"، قوم و ملک کی قیادت کا سب سے زیادہ مستحق اور اپنی عزت و احترام کا سب سے بڑا "تاجدار" سمجھے تھے، اب دفعتہً اُسی بروٹس اور اُسی کے رفقاء کے خون کے پیاسے ہو گئے اور اُن میں سے جتنے اُنھیں مل سکے تہ تیغ کر ڈالا اور اس طرح چشم زدن میں شاہی بساط اُلٹ دی گئی اور ایوان حکومت تاراج کر ڈالا گیا

بعض الفاظ اور فقرے اپنے اندر مقناطیسی قوت رکھتے ہیں، لیکن اُن کی قوت تاثیر میں اُن کے مفہوم کو کبھی دخل نہیں ہوتا، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ الفاظ جو مجمع پر زیادہ اثر کرتے ہیں، سامعین کے دلوں میں کچھ اس طرح گھر کر جاتے ہیں کہ اُن کے متعلق لوگوں کا یہ اعتقاد ہو جاتا ہے کہ تمام اجتماعی مشکلات کا حل انھیں الفاظ کے ساتھ وابستہ ہے

اس قسم کے الفاظ اور فقروں کی حالت یہ ہوتی ہے ادھر مقرر کی زبان سے نکلے اُدھر سامعین پر ایک ہیبت سی چھا گئی، اور احترام و عظمت نے اُن کو سرنگوں کر دیا، گویا اُن میں ایک طاقت الٰہی مضمر ہوتی ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی مگر اُن کی مخفی طاقت چند لمحوں کے اندر بڑے بڑے زاہدوں اور عابدوں کے قلوب میں جھرجھری پیدا کر دیتی ہے جس سے اچانک وہ تڑپ اُٹھتے ہیں

حضرت ابوبکر صدیق کی وہ مشہور تقریر جو انھوں نے رسول خدا صلعم کے انتقال کے بعد مسلمانوں کے اضطراب کو مٹانے کی غرض سے کی تھی۔ اسی قسم کی تھی، آپ نے صحابۂ کرام کو مخاطب فرما کر کہا:۔

اَلَا، من کان یعبد محمداً فان محمداً قدمات ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حیٌّ لایموت وما محمدٌ الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئاً وسیجزی اللہ الشاکرین

ہاں! جو لوگ محمدؐ کو پوجتے ہیں اُنکو معلوم ہونا چاہیئے کہ محمدؐ کا انتقال ہو گیا، لیکن جو لوگ خدا کو پوجتے ہیں اُنکو جاننا چاہیئے کہ خدا زندہ ہے جو مرے گا نہیں، محمد صلعم تو صرف ایک پیغمبر تھے، اُن سے پہلے بھی پیغمبر گزر چکے ہیں۔ کیا وہ اگر مر گئے یا شہید کر دئے گئے تو تم لوگ پھر اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جاؤ گے، جو لوگ اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جائیں گے وہ خدا کو کچھ نقصان نہیں پہونچائینگے، خدا شکر کرنے والوں کو جلد جزائے خیر دیگا۔

یہ چند جملے تھے لیکن اس مختصر سی تقریر کا لوگوں پر یہ اثر ہوا کہ روتے روتے سب کی ہچکیاں بندھ گئیں اور لوگ مسجد سے نکلے تو یہی آیت پڑھتے ہوئے نکلے۔ حضرت عمرؓ جن کو سب سے زیادہ اس بات پر اصرار تھا کہ "رسول خدا کا انتقال نہیں ہوا ہے" جب انھوں نے حضرت ابوبکر کی زبان سے اس آیت کو سنا تو وہ فرماتے ہیں کہ اُسوقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ آیت آج ہی نازل ہوئی ہے۔

ذاتی سطوت کا خطابیات پر اثر

تقریر کی کامیابی کا انحصار ایک حد تک ذاتی سطوت اور شخصی نفوذ پر بھی ہوتا ہے جن لوگوں میں یہ مقناطیسی قوت پائی جاتی ہے وہ اپنے ذاتی غلبہ کے بل پر اپنے خیالات کو سامعین کے ذہنوں میں راسخ کر دیتے ہیں اور لوگ اُن کی اس طرح اطاعت کرتے ہیں جس طرح حیوانات اپنے مالک کے مطیع ہوتے ہیں اس قسم کی فطری اور ذہنی سطوت قوموں کے اُن تمام بڑے بڑے آدمیوں کو حاصل ہوتی ہے جنھوں نے اپنے کارناموں سے دنیا پر دھاک بٹھا دی ہے

دنیا میں جو صاحب سطوت ہستیاں گزری ہیں اُن کے کارناموں سے گو اُن کی پوزیشن بڑھ جایا کرتی ہے لیکن اُن کی ذاتی سطوت اور اُن کا شخصی نفوذ کبھی خارجی مؤیدات کا ممنونِ احسان نہیں ہوتا، بلکہ شہرت سے قبل ہی اُن میں ایک ایسی تسخیر کی قوت پائی جاتی ہے جو قلوب انسانی کو اپنی طرف کھینچ لیا کرتی ہے اور اُن پر اپنے رعب کا سکہ جما دیتی ہے

نپولین جب پہلی مرتبہ گرفتار ہوا تو کچھ عرصہ کے بعد موقع پاکر فرار ہو گیا، اُس کے قدیم سپاہیوں کی ایک مختصر سی جماعت اُس کے ساتھ تھی جو بلحاظ تعداد، بلحاظ آلات جنگ اور سامان رسد اس قابل نہ تھی کہ کسی قوی حریف کا مقابلہ کر سکتی، مگر اس باہمت معزول تاجدار نے اُسی کی مدد سے ملک فرانس بلکہ تمام یورپ کے خلاف اپنے تخت پر قابض ہونے کی ٹھان لی

پہلے ہی معرکہ میں بیس ہزار تازہ دم جوانوں کا سامنا کرنا پڑا، ایسے نازک موقع پر کوئی دوسرا ہوتا تو بدحواس ہو جاتا، لیکن نپولین تن تنہا غیر مسلح اپنی صف سے نکلا اور کمال اطمینان کے ساتھ فریق مخالف کی صف کے سامنے آکھڑا ہوا، اور سینہ کھول کر ایک پر اثر لہجہ میں اپنے مخالف سپاہیوں سے جن میں سے اکثر کسی زمانہ میں اُسی کے ماتحت رہ چکے تھے خطاب کر کے للکارا کہ "تم میں سے کون ہے جو اپنے باپ کے عریاں سینہ پر فیر کرنے کو تیار ہے؟" اس آواز کا ساحرانہ اثر ہوا، ہر طرف سے "کوئی نہیں، کوئی نہیں" کی صدا بلند ہوئی اور وہ فوجی افسر جو نپولین کو گرفتار کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے اور جنھوں نے اُس کے قید کر کے لانے کا حلف اُٹھایا تھا، سب کے سب اُس کی صورت دیکھتے ہی اُس کے حلقہ بگوش بن گئے اور معاً تمام سپاہی اپنی جماعت چھوڑ کر اُس کے علم کے نیچے آ گئے

غزوۂ حنین میں جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو اب کو یہ جمع دامنگیر ہوئی کہ مال غنیمت جلد از جلد تقسیم کر دیا جائے، یہ خواہش بیتابی کی حد تک پہونچ گئی، آنحضرت صلعم نے مال غنیمت کا بڑا حصہ قریشی سرداروں کو دیدیا اور اُن کے مقابلہ میں انصار مدینہ کو گویا کچھ بھی نہیں دیا، اس پر گروہ انصار میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں اور انھوں نے آپس میں کہنا شروع کیا کہ "خدا پیغمبر کی مغفرت کرے، آخر انھوں نے اپنی ہی عزیزوں اور

ہموطنوں کا ساتھ دیا اور ہمیں چھوڑ دیا، حالانکہ خون ہماری تلواروں سے ٹپک رہا ہے"

آنحضرت صلعم کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے صرف انصار کو ایک خیمہ میں جمع کیا اور اصل واقعہ کے متعلق دریافت کیا، انصار نے عرض کیا کہ "ہم میں سے کسی ذمہ دار شخص نے ایک لفظ بھی نہیں کہا، ہاں چند ناتجربہ کار نوجوانوں نے یہ ضرور کہا ہے" آپ نے اس وقت ایک پرجوش تقریر فرمائی، جس کے جستہ جستہ فقرے مختلف حدیثوں میں ملتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:۔

یا معشر الانصار! الم اجدکم ضلالاً فھداکم اللہ بی، وکنتم متفرقین فالفکم اللہ بی، وعالۃً فاغناکم اللہ بی

گروہ انصار! کیا میں نے تم کو گمراہ نہیں پایا پس خدا نے مری وجہ سے تم کو ہدایت کی، تم متفرق تھے خدا نے مری وجہ سے تمہارے دلوں میں محبت اور یک جہتی پیدا کی، تم محتاج اور مفلس تھے خدا نے مری وجہ سے تمکو مالدار بنا دیا۔

آپ یہ فرما رہے تھے اور ذاتی سطوت اور خطابت کی سحر طرازی کا یہ عالم تھا کہ اُسوقت صدہا متنفس میں ایک شخص بھی ذی روح معلوم نہیں ہوتا تھا، ہر شخص ہمہ تن گوش بنا ہوا ایک ربودگی کے عالم میں آپ کے چہرہ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا، آپ نے سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے ان کے اصل اعتراض کا جواب دیا اور فرمایا:۔

اما ترضون ان یذھب الناس بالشاۃ والبعیر وتذھبون بالنبی الی رحالکم؟ فواللہ لما تنقلبون بہ خیرٌ مما ینقلبون

(بخاری غزوۂ حنین صفحہ ۶۲۰)

کیا تم پسند نہیں کرتے ہو کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لیجائیں اور تم اپنے گھروں میں خود پیغمبر کو لے جاؤ؟ خدا کی قسم تم جو لیکر جاؤ گے وہ اُس سے بہتر ہے جو دوسرے لوگ لیجائیں گے۔

اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ وہی انصار جو چند منٹ پہلے کبیدہ خاطر ہو رہے تھے اسقدر روئے کہ اُنکی داڑھیاں تر ہو گئیں اور وہ سب بیک آواز پکار اُٹھے:۔ "رضینا"

سطوت ذاتی کی یہی وہ صفت تھی جس نے صحرائے عرب کے ایک ان پڑھ کی سب سے تسلیم کرائی اور قاعدین عظام کی صف میں اُسے ایک ممتاز جگہ دینے میں تمام دوسری خصوصیات سے زیادہ اُسکی مدد کی۔

خطبہ کے اجزا

خطبہ کے تین جز ہوتے ہیں۔ مقدمہ، اثباتِ مدعا، خاتمہ۔ مقدمہ میں خطیب کو دو چیزوں کا خیال رکھنا چاہئے، اول تو یہ کہ تقریر کی ابتدا ایسی خوبی سے ہو کہ سامعین اُس کے سننے کی طرف مائل ہو جائیں اور اُن کے دلوں پر اُس کی ہمدردی کا سکہ بیٹھ جائے، وہ جو کچھ بیان کرے اُسے غور سے سنیں اور حرف بحرف صحیح سمجھیں۔ دوسرے یہ کہ اُن کو تقریر کا مقصد اجمالی طور سے معلوم ہو جائے

عہد قدیم میں خطبا عرب کا دستور تھا کہ وہ خطبۂ حمد و ثنا سے شروع کرتے تھے پھر براعۃ استہلال کے طور پر ایسی باتیں بیان کرتے تھے جس سے مقصد کی طرف مجملاً اشارہ ہو جائے، اُس کے بعد اپنے مقصد کو دلایل سے ثابت کرتے تھے

اہل عرب اکثر کجاووں پر بیٹھکر خطبہ دیا کرتے تھے خود آنحضرت صلعم نے بعض مواقع پر اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھکر خطبہ دیا ہے، مگر علامۂ جاحظ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ آپ نے بعد میں اس کو ممنوع بھی قرار دیدیا تھا[1]

عصا یا اسی قسم کی کوئی چیز لیکر خطبہ دینا جس پر ٹیک لگائی جا سکے بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ ابن ماجہ میں ہے کہ آنحضرت صلعم جب مسجد میں خطبہ دیتے تھے تو دست مبارک میں عصا ہوتا تھا اور میدان جنگ میں جب خطبہ دیتے تھے تو کمان پر ٹیک لگاتے تھے

اب تقریریں مغربی تہذیب کے موافق زیادہ تر اس قسم کی رسمی چیزوں سے خالی ہوتی ہیں، اب خطیب یا اسپیکر عموماً تکلفات سے بچکر بہت ہی سادے اور لطیف پیرایہ میں تقریر کا آغاز کرتے ہیں، یہ چیز نئی نہیں ہے، عہد قدیم میں بھی کہیں کہیں اس کی مثالیں ملتی ہیں، نمونہ کے طور پر حضرت جعفر طیار کی وہ تقریر جو انھوں نے محامد اسلام پر نجاشی بادشاہ حبشہ کے سامنے کی تھی درج ذیل ہے، علماء ادب متفق اللفظ ہیں کہ محامد اسلام پر آج تک اس سے بہتر کوئی تقریر نہیں ہوئی وہو ہذا

"اے بادشاہ! ہم جاہل اور گمراہ تھے، ہم بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے رشتہ داری کو توڑتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے اور ہم میں کے قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے، اسی اثنا میں خدا نے ہماری طرف ایک نبی بھیجا، جس کی شرافت نسبی، راست بازی، دیانت داری اور پاکبازی سے ہم بخوبی واقف تھے، اُس نے ہم کو خدا کی وحدانیت کی طرف بلایا، اور یہ سکھلایا کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، اور اُن بتوں کی پرستش چھوڑ دیں جن کو ہم پہلے پوجا کرتے تھے، اُس نے حکم دیا کہ سچ بولو، صلۂ رحمی کرو، ہمسایوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آؤ، حرام کاریوں اور زنا سے بچو، اُس نے ہم کو برائیوں سے روکا اور کہا کہ جھوٹی باتیں نہ کہو، یتیم کا مال نہ کھاؤ، اُس نے ہم کو حکم دیا کہ ہم نماز پڑھیں زکوۃ دیں، اور حج کریں، ہم اُس پر ایمان لائے اور ہم نے اُسکو سچا جانا"

اثبات مدعا خطیب کو تقریر شروع کرنے سے پہلے جس چیز کی فکر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جو کچھ اُسے بیان کرنا ہے اُسے دلائل سے ثابت بھی کرے، اِس لئے کہ کوئی دعویٰ بغیر دلیل کے مانا نہیں جاتا، اثبات مدعا میں اُس کو قیاسات کی بھی ضرورت پڑتی ہے لیکن خطابت میں منطقی قیاسات سے کام نہیں لیا جاتا اس لئے اُس کی

---

[1] آپ نے فرمایا ہے:- "لا تجعلوا ظہورکم مجالسا" (کتاب البیان والتبیین صفحہ ۱۴۱)

بناء اکثر یقینی مقدمات پر ہوا کرتی ہے اور خطابی قیاسات عموماً مسلمات ہوا کرتے ہیں

درحقیقت استدلال عوام کے لئے ایک بے معنے چیز ہے کسی دعوے کو ثابت کرنے کے لئے سامعین نہ ثبوت کا مطالبہ کرتے ہیں اور نہ اُس کے شواہد تلاش کرتے ہیں بلکہ اُن کے یقین کرنے کے لئے صرف اتنا کافی ہوتا ہے کہ جس چیز کا اُنھیں یقین دلانا منظور ہو اُس کی تصویر اُن کی نظروں کے سامنے پھر جائے اور بس

کسی خیال کو عوام کے دل میں جمانے کا بہترین طریقہ اُس کے متعلق وعظ کرنا نہیں بلکہ اُس خیال کی تصویر مجمع کے سامنے پیش کرنا ہے۔ شعورِ خفی کا جس سے نفسِ اجتماعی کا خمیر ہوتا ہے یہ خاصہ اساسی ہے کہ محض افکار و خیالات اُسکے لئے ناقابلِ قبول ہیں، وہ صرف اُس بیان کو قبول کر سکتا ہے جس سے کسی واقعہ کی تصویر اُس کی نظروں کے سامنے پھر جائے، اُس کو مخاطب کر کے یہ کہنا بالکل بے سود ہے کہ مرنے کے بعد روح کو سرورِ ابدی حاصل ہوتا ہے، وہ اگر متاثر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ مرنے کے بعد تمھیں بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ملیں گی کھانے کے لئے دودھ، شہد انار، انگور اور ہر طرح کے تر و تازہ میوے ملیں گے اور خدمت کے لئے ہر وقت خوبصورت غلام کمربستہ رہیں گے۔

مجمع کے سامنے اگر آلام دوزخ اور لذائذ جنت محض ایک عام کلیہ کے طور پر بیان کر دئے جائیں تو اُن پر کچھ اچھا اثر نہ پڑے گا، لیکن انھیں چیزوں کی تفصیلات کی تصویر اگر اُن کے سامنے پیش کر دی جائے تو بچہ، بوڑھا، مرد، عورت، خواندہ، ناخواندہ سب ہی بے اختیار ہو جائیں گے

خطباء جو لوگوں کی قیادت کرنا جانتے ہیں وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے ہیں اس لئے تقریر میں ہمیشہ وہ اپنا روئے سخن سامعین کے جذبات کی طرف رکھتے ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ وہ کتنے کامیاب رہتے ہیں

لیکن منطقی جو پرزور دلائل منطقیہ سے کسی چیز کو ثابت کرنے کے عادی ہو گئے ہیں مجمع کو مخاطب کرنا نہیں جانتے وہ ہمیشہ مذکورۂ بالا اُصول کو نظر انداز کر کے اپنے دعووں کو منطقی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے مجمع پر ذرہ برابر اثر نہیں پڑتا، ممکن ہے اس طریقہ سے عوام مرعوب ہو کر اُن کی قابلیت کے قایل ہو جائیں لیکن اس سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا اور نہ کبھی اُن پر صدائے تحسین بلند کی جاتی ہے، منطقی قیاسات اور دلائل اگر کارآمد ہو سکتے ہیں تو صرف اہلِ علم کے لئے، عوام کی حالت اُس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، وہ بحث و مباحثہ سے گھبراتے ہیں اور دلایل سننے کی طاقت نہیں رکھتے، وہ ایسی تقریروں کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو ایچ پیچ اور عقلی دلایل سے خالی ہو، اُن پر جن چیزوں کا اثر ہوتا ہے وہ وہی چیزیں ہیں جن کا تعلق محض اُن کے احساسات و جذبات سے ہے۔ دنیا نے آج تک جن چیزوں کے ماتحت رہ کر ترقیاں کی ہیں وہ وہی احساسات اور جذبات ہیں جن کو ہمیشہ عظیم الشان انقلابات میں دخل رہا ہے، سچ تو یہ ہے کہ اگر انسانی تمدن کی بنیاد ان احساسات اور جذبات پر نہ ہوتی تو شاید انسان کو یہ عظیم الشان ترقیاں بھی نصیب نہ ہوتیں۔

جلیل الرحمان اعظمی

مکتوباتِ نیاز

حضرت،

آپ کیوں خواہ مخواہ، جرأت کو بُرا کہتے ہیں۔ "کیا تمھارا غریب لیتا ہے"۔۔۔ سچ ہے بدا چھا بدنام بُرا۔ کیا میر کے کلام میں سوقیانہ اشعار نہیں ہیں، کیا مومن اس بدمذاقی سے بالکل بچا ہوا ہے، کیا غالب کا ہر شعر معیارِ ذوق پر پورا اُترتا ہے۔ پھر جرأت کو بُرا کہتے ہو تو انھیں بھی کہو

آپ کہیں گے شاعر کے رنگ کو دیکھ کر حکم لگایا جاتا ہے، تو کیا جرأت کے کلام کا اکثر حصہ وہی ہے جسے آپ فحش و بازاری وغیرہ خدا جانے کیا کیا کہتے ہیں

اچھا بتائیے، یہ اشعار کس کے ہیں؟

داں سے آیا ہے جواب خط کوئی سنیو ذرا ! میں نہیں ہوں آپ میں مجھ سے نہ سمجھا جائے گا

جب تلک کرتے رہے مذکور اسکا مجھ سے لوگ جی میں کچھ سوچا کیا میں اور دل دھڑکا کیا

ملکِ دل میرا سدا سنسان ہی رہتا ہے آہ سب نگر بستے ہیں یارب اس نگر کو کیا ہوا

خاک ہو جانا دلِ سوزاں کا کیا آتا ہے یاد راکھ ہوتے دیکھتے ہیں جب کسی اخگر کو ہم

لوگ سب کہتے ہیں اس بیمارِ غم کو کیا ہوا جانتے ہم بھی نہیں ہیں یہ کہ ہم کو کیا ہوا

دل ہے جب تک عشق کا انکار کر سکتے نہیں پردہ جب پوچھے ہے تو اقرار کر سکتے نہیں

یارو کہو ہر بار نہ کچھ کان میں اپنے — کیا جانیں کہ ہم بیٹھے ہیں کس دھیان میں اپنے

اس چشم پہ آنکھ پڑتے ہی ہم نے کہا — جادو برحق ہے کرنے والا کافر

پڑے ہے بزم میں جس شخص پر نگاہ تری — وہ منھ کو پھیر کے کہتا ہے اُف پناہ تری

غضب خدا، جس کے دیوان میں سیکڑوں اشعار اس رنگ کے پائے جائیں اُسے آپ "لغو گو بازاری" کے نام سے یاد کریں

عطوفت پناہا، محبت دستگاہا - حقیقت یہ ہے کہ آپ ایسی ہستیاں دنیا میں نہ ہوں تو یہ "کارگہ شیشہ گری" ایک دن نہیں چل سکتا۔ آپ نے جس لطف و خلوص سے کام لیکر میرزا صاحب کی امداد کی ہے اس کا شکریہ ممکن نہیں۔ "سچ یہ ہے آپ نے گرتا ہوا گھر تھام لیا"

کل شام کو وہ میرے پاس تشریف لائے اور تفصیل کے ساتھ پوری داستان سنائی۔ میں حیران تھا کہ وہ اس دنیا کی باتیں کر رہے ہیں یا کسی اور سرزمین کی، انسانی رافت و خلوص کا قصہ کہہ رہے ہیں یا کرّ و بیان ملاءِ اعلیٰ کی شرافتِ نفس کا۔ بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ آپ میرے سامنے ہوتے اور میں آپ پر قربان ہو جاتا، گو یہ بھی نہایت ہی ناقص و نامکمل صورت اعتراف احسان کی ہوتی

خیر، یہ تو سب کچھ ہوا اور جس حد تک مسیحائی کا تعلق ہے، آپ نے ایک مردہ کو جلا بھی لیا، لیکن یہ تو فرمائیے کہ زندگی محض سے کیا کام چل سکتا ہے جب تک اس کے بقا کی امید نہ ہو۔ تنِ بسمل میں سانس تو آنے جانے لگی ہے لیکن اگر بیمار نے پھر سنبھالا لیا تو کیا ہوگا

خدا کے لئے جہاں یہ کیا ہے وہیں اس کا بھی انتظام کر دیجئے کہ ان کا تعلق اب اس ظالم سے باقی نہ رہے میں سچ کہتا ہوں وہ یزید پھر وار کریگا اور ضرور کریگا، پھر میں کب تک آپ کو تکلیف دیتا رہوں گا اور یہ غریب تا کے اس سولی کے دھڑکے کو برداشت کریں گے

آپ تو اس شعبہ سے ان کا تبادلہ کرا دیجئے اور خود اپنے دفتر میں لے لیجئے، اگر آپ خود اپنی خدمت میں نہیں رکھ سکتے تو کسی ایسے شریف افسر کے پاس بھیج دیجئے جو میر صاحب کی طرح کثیر الاولاد بھی ہو اور اپنی اولاد سے محبت بھی کرتا ہو —— یہ احسان مجھ پر ہوگا

اے ،

کیا پوچھتے ہو کیا کر رہا ہوں - نہ یاد رفتگاں کا مشغلہ ہے کہ کچھ دیر اسی سے جی بہلے نہ "عشق بتاں" کا حوصلہ کہ کچھ وقت سر ٹکرانے میں گزر جائے - اب تو حال کی سوگواریاں ہیں یا مستقبل کی حوصلہ فرسائیاں، جیوں تو کیونکر اور مروں تو کیوں ؟ جب تک وہم و خیال کی دنیا میں جیتا تھا — چشم واکردن زمیں تا آسماں آغوش داشت — لیکن اب کہ تعینات و حقایق کے خبط میں مبتلا ہوں — "سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے"

ہائے ری عقل ہرزہ کار ! خدارا تمھیں بتاؤ اس بوجھ کو سر سے اُتار کر کہاں پھینک دوں، اس عذاب سے کیونکر نجات حاصل کروں - میں تو زندگی کے اس منطقی اسلوب سے

کہ یہ نہ ہو تو کہاں جائیں اور ہو تو کیونکر ہو

سخت عاجز آگیا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ کسی کو مار ڈالوں اور مر جاؤں - خود تنہا اس لئے جان دینا نہیں چاہتا کہ عقل کے کھیل میں ٹریجڈی کی تکمیل اس طرح ممکن نہیں

ہاں ، خوب یاد آیا، کل ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو ابھی حج کر کے واپس آئے ہیں - انھوں نے سفر کی آسانیوں اور وہاں کی دلچسپیوں کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا کہ طبیعت بے اختیار ہو گئی - بولو کیا کہتے ہو ؟

جاؤ بھی ، تم کس زمانہ کی باتیں کر رہے ہو — درکارِ عشق نالہ و آہے ضرور نیست — یہ اس وقت کا اُصول تھا جب انسان پہلے حسین پیدا ہوتا تھا اور اس کے بعد معشوق بنتا تھا، لیکن اب کہ معشوقیت نے حُسن سے بالکل جدا ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے ، کاروبارِ محبت بالکل بدل گیا ہے اور جب تک آہ و زاری سے کام نہ لیا جائے ، جذبۂ معشوقیت کو تسکین ہوتی ہے نہ عشق "حدودِ تعینات" میں آتا ہے

یہ تمام مظالم ڈارون کے ڈھائے ہوئے ہیں - ورنہ اس سے پہلے قوی کے ساتھ ضعیف بھی اپنی زندگی کسی نہ کسی طرح بسر کر لیجاتے تھے - لیکن اب بقا کے لئے "تنازع" کا مفہوم ہی یہ رہ گیا ہے کہ قوی ضعیف کو تباہ کر دے اور ضعیف بے چون و چرا اپنے آپ کو تباہ ہو جانے دے - وہ تو کہو کہ اشتراکیت کا دور شروع ہو گیا ہے اور ایک چیز احتجاج یا ستیاگرہ ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ سبزۂ پامال کو بھی نہال ہونے کا موقعہ ملجاتا ہے ، ورنہ ہم تم تو کبھی کے ختم ہو گئے ہوتے

بہر حال میرے نزدیک خاموشی مناسب نہیں ہے ، تم کو پوری کوشش کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہئے - خدا پر بھروسہ کر کے ہاتھ پاؤں ڈال دینا خود خدا کو بھی پسند نہیں آتا - دنیا میں وجود کے ساتھ "اثباتِ وجود" از بس ضروری ہے - زمانہ سے زیادہ فراموشکار کوئی نہیں، تم نے ذرا تقاضہ میں کمی کی اور وہاں صاف انکار ہو گیا -

اس لئے اگر زندہ رہنا ہے (اور زندہ رہنا ہی پڑے گا، اپنے لئے نہ سہی اوروں کے لئے) تو یہ کرنا ہی پڑے گا۔ اب زمانہ "جیو اور جینے دو" کا نہیں ہے بلکہ "خود جیو اور کسی اور کو نہ جینے دو" کا ہے، اس لئے جب تک لوگوں کو ستاتے رہو گے، مزہ میں رہو گے۔ "میں جاہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا"۔ اب نہ عاشقی میں شمار ہوتا ہے نہ انسانیت میں۔ زبردستی محفل میں اپنے لئے جگہ پیدا کرو اور سب کو نکال باہر کرو، یہ ہے اس عہد کا فلسفۂ کامیابی۔ "بیخودی" کا زمانہ گیا اب دور "خودی" کا ہے۔ یعنی اس منزل کا جب انسان خدا سے قریب تر ہوتا جاتا ہے

بندہ نواز،

بڑا مشکل سوال ہے۔ میں کیا اگر آپ خود غالب سے پوچھتے کہ اس کا بہترین شعر کونسا ہے تو وہ اس کا جواب نہ دے سکتا، کیفیات کے ساتھ پسندیدگی کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس وقت مجھے اس کا یہ شعر اچھا معلوم ہو:۔

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی — منھ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے

لیکن دوسرے وقت میں اس شعر پر جھوم رہا ہوں:۔

ہے شکستن سے بھی دل نومید، یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرض گرانجانی کرے

لیکن اگر آپ یہ پوچھیں کہ اس کا بدترین شعر کون ہے تو بیشک میں بتا سکتا ہوں کہ یہ:۔

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے — بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہئے

حسن میں جتنا تنوع ہے، قبح میں نہیں ہے، محبت کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں لیکن "نفرت" ایک ہی ہے خوبصورتی میں نگاہ کے لئے مختلف زاویوں کی گنجایش ہے لیکن بدصورتی میں صرف ایک کی۔ اس لئے "بدترین" کی تعیین اتنی دشوار نہیں جتنی "بہترین" کی۔ آپ نے اگر کوئی شعر ایسا انتخاب کیا ہو تو میں بھی سننا چاہتا ہوں

محترمی،

صحیفۂ گرامی ابھی ابھی پہونچا۔ میرے لئے اس سے زیادہ مسرت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کوئی حکم دیں اور میں اس کی تعمیل کروں، لیکن اس زندگی میں اس سے پہلے بھی بارہا ایسی مسرت خیز گھڑیاں نصیب ہوئیں اور میں کبھی اُنسے فائدہ نہ اُٹھا سکا معلوم ہوتا ہے اس وقت بھی میری بدنصیبی مجھے اس لطف سے محروم رکھے گی

یقیناً کام نہ زیادہ محنت کا ہے، نہ زیادہ اُلجھن کا۔ لیکن بہر حال وہ وقت چاہتا ہے اور یہ ترکیب آج تک

میری سمجھ میں نہیں آئی کہ سورج کو ٹھیک وقت پر غروب ہونے سے روک دوں۔ گھنٹے کے ساٹھ منٹ کمبخت ساٹھ ہی منٹ میں ختم ہو جائیں گے۔ اکسٹھواں منٹ شروع ہوا اور دوسرا گھنٹہ لگا

آپ کو معلوم نہیں اس وقت تک میں کتنا کام کر چکا ہوں۔ بُرے بھلے کا ذکر نہیں۔ اگر کوئی شخص ۲۰ سال کی عمر میں صرف اس کی نقل کرنے بیٹھ جائے تو جس وقت وہ ختم کرے گا تو "فرو ریزد پر و بال" کی منزل بھی گزر چکی ہوگی پھر یہ سنکر آپ کو غالباً اور زیادہ حیرت ہوگی کہ اس قدر جھک مارنے کے بعد یہ معلوم ہوا ہے کہ مطالعہ کی عمر حقیقتاً اب آئی ہے، جی یہ چاہتا ہے کہ آبادی سے دور لب آب ریتلی زمین پر ایک جھونپڑا پڑا ہو اور وہاں سوائے کتابوں کے کچھ نہ ہو حتےٰ کہ پنسل و کاغذ بھی نہیں

بہر حال اب اُفتادِ مزاج کی صورت یہ ہے اور اگر اب بھی آپ کا اصرار یہی ہے کہ میں ضرور لکھوں تو انکار تو کروں گا نہیں، لیکن کام وقت پر ہو جائے، اس کی ذمہ داری کسی طرح نہیں لے سکتا

اگر آپ مشورہ مانیں تو عرض کروں کہ کیوں نہ آپ یوسف صاحب کو اپنے پاس چند دن کے لئے بلالیں، آدمی محنتی ہیں، ذہین ہیں، خوش ذوق ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہر وقت آپ کے پاس رہیں گے اور جس طرح آپ فرمائیں گے، مرتب کرتے رہیں گے۔ ممکن ہے میں لکھوں اور آپ کو پسند نہ آئے، یا اگر پسند بھی آئے تو وقت گزرنے کے بعد۔ اگر زحمت نہ ہو تو مطلع فرمایئے کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا

جناب محترم

تسلیم، آپ نے شاعری کی جتنی تقسیمیں اندازِ بیان کے لحاظ سے کی ہیں، ان سے مجھے بالکل اتفاق ہے لیکن مبالغہ کے علاوہ ایک قسم اور بھی ہے جس کو نکتہ وری کہتے ہیں۔ میں ذرا وضاحت کر دوں

ایک شاعری تو یہ ہوئی کہ عامۃ الورود واقعات کے لئے سہل و سادہ الفاظ اور سلیس اندازِ بیان سے کام لیا جائے جو فارسی میں سعدی کا اور اُردو میں میر و درد کا رنگ ہے۔ مثلاً:-

یاں سے واں، واں سے یہاں حکم ہوا اوصل کی شب ہم اُٹھاتے ہی بچھاتے رہے بستر اپنا

دروا و حسرتا کہ عنانم ز دست رفت دستم نمی رسد کہ بگیرم عنان دوست

جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں

ترا چہ غم کہ مراد رغمت نگیرد خواب تو بادشاہ کجا یاد پاسباں آری

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

یہ تو ہوئی وہ حقیقی شاعری (شاعری سے میری مراد یہاں صرف تغزل ہے) جسے ہم صرف محبت کی زبان کہہ سکتے ہیں اب اس کے بعد انداز بیان میں جسقدر زیادہ پیچیدگی و نزاکت پیدا ہوتی جائے گی، کیفیات عشق اتنی ہی ضعیف ہوتی جائیں گی لیکن آرٹ ان کی جگہ لے لیگا اور یہیں پہونچکر ایک شاعر کے حقیقی جوہر کھلتے ہیں کہ وہ کس حد تک آرٹ کو تغزل میں تحلیل کرسکتا ہے اور جذبات کے فقدان کی تلافی وہ آرٹ کے ذریعہ سے کس حد تک کرسکا ہے، غالب کی غزلوں میں یہ تمام مدارج اکثر نظر آتے ہیں، مثلاً اس کی وہ غزل لے لیجئے۔ آجائے ہے۔ پا جائے ہے۔ اس میں صحیح تغزل: جذبات کا شعر ملاحظہ ہو:۔

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائے ہے دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

اس کے بعد یہ جذبات کم ہوتے ہیں اور آرٹ شامل ہوتا ہے لیکن تغزل ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔ مثلاً:۔

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دار راز عشق پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

غالب ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے لیکن ناگوار صورت پیدا نہیں ہوتی:۔

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

یہ آرٹ کے استعمال کی آخری حد ہے لیکن غالب اس سے اور آگے بڑھ جاتا ہے اور اب جو کچھ کہتا ہے وہ یکسر تغزل سے باہر ہوتا ہے اور صرف آرٹ ہی آرٹ رہجاتا ہے ملاحظہ ہو:۔

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں کھینچتا ہے جسقدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

یہ وہ اشعار ہیں کہ اگر وزن و قافیہ علٰحدہ کرکے ان کا ترنم دور کردیا جائے تو دل و دماغ کے علاوہ سامعہ کو بھی ناگوار ہوں یہ مبالغہ ہوا نکتہ وری نہ ہوئی

مبالغہ میں اگر حسن پیدا ہوسکتا ہے تو صرف اسی انداز سے۔ فارسی میں اس کی مثالیں تو ملجائیں گی لیکن اُردو میں بہت کم۔ بیدل کی شاعری میں اس رنگ کے اشعار اکثر نظر آتے ہیں اور یہ اس کا معجزہ ہے کہ تغزل سے کسی جگہ نہیں ہٹتا۔ کہتا ہے:۔

باغے کہ بہارش ہمہ سنگ ست دلِ او
دشتے کہ غبارش ہمہ آب ست دلِ ما

اس سے زیادہ آرٹ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اضداد کو یکجا کر دیا جائے، لیکن یہ بیدلؔ کا کمال ہے کہ "پتھر، پانی، اور خاک" سب کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر اس نے اس طرح پیش کر دیا کہ تنافر محسوس کرنے کے بجائے آپ ایک خاص کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ ایک شعر اور سنئے :۔

کفِ خونے کہ دارم تا چکیدن خاک می گردد
چساں گیرم بہ ایں بے مایگی دامانِ قاتل را

مصرعۂ اول میں جو دعوے کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں لیکن دوسرے مصرعہ میں اسقدر غضب کی کششِ تغزل ہے کہ ذہن کو یہ سوچنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا کہ وہ خون کے خاک ہو جانے پر غور کرے

دوسرا شعر ملاحظہ ہو :۔

زیں رنگ فسوں پردازی اُلفت چہ می پرسی
تو در آغوشی و من کشتۂ از دور دیدنہا

یہاں بھی وہی جمع اضداد ہے یعنی قرب و بُعد کو یکجا کر دیا گیا ہے، لیکن آپ اسے مبالغہ قطعاً نہیں کہہ سکتے پھر یہ کیا ہے ؟ وہی نکتہ وری

بیدلؔ کے بعض اشعار اس معیار سے گرے ہوئے بھی نظر آتے ہیں اور باوجود مبالغہ نہ ہونے کے بھی ان میں کوئی نکتہ آفرینی نہیں پائی جاتی، یعنی ادعائے شاعرانہ تو ہے لیکن ثبوت اچھا بہم نہیں پہونچ سکا، مثلاً :۔

دل گم گشتہ سراغے ست زکیفیتِ شوق
نشہ بالد اگر از دست رود شیشۂ ما

ایک شعر ایسا ہی اور سنئے :۔

عیش داند دلِ سرگشتہ پریشانی را
ناخدا باد بود کشتیِ طوفانی را

اس میں بھی کوئی بات نہیں۔ الغرض مبالغہ اور نکتہ وری میں فرق کرنا ضرور ہے اگر آپ اس بیان کو بھی شامل کر لیں تو آپ کا مقالہ ہر لحاظ سے مکمل ہو جاتا ہے ۔ سمع خراشی معاف!

حضت سلامت،

آپ ویرانی و بے سر و سامانی کا حال کیا پوچھتے ہیں۔ غالبؔ گھر بھی رکھتا تھا اور دربان بھی چنانچہ جب گھر کی گھاس زیادہ بڑھ جاتی تھی تو وہ دربان کو حکم دیتا تھا کہ گھاس کھود کر گھر صاف کر دے۔ یہاں معاملہ ہے خالص

"کاوِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی" کا جس میں اگر کوئی شرکت و ہمدردی کرے بھی تو اپنے کو گوارا نہیں

آپ کی دلدہی سے میرا جی کچھ خوش تھوڑا ہی ہوا، لیکن چونکہ آپ اس رمز سے واقف نہیں ہیں اور یہ قصور لاعلمی کی وجہ سے ہوا ہے، اس لئے معاف کرتا ہوں ـــ دنیا میں کیا آپ کے لئے بھی اب کوئی لطف باقی نہیں رہا جو بوڑھیوں کی طرح ردِ بلا کی دعائیں دینے لگے۔ میں تباہ ہوں تو ہوا کروں، لیکن آپ کی گرمیِ محفل کا حال سنکر تو خوش ہوتا ہوں۔ پھر وہ بات آپ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں جس کے جواب میں سوائے اس کے میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ "آپ سے مطلب ؟"

مجموعۂ استفسار و جواب کا تیسرا حصّہ

شایع ہوگیا

یہ کتاب کیا باعتبار اپنی گوناگوں علمی و ادبی، تاریخی و تنقیدی مذہبی و معاشرتی مباحث اور کیا باعتبار جامعیت اتنی مکمل ہے کہ زبان اُردو اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس میں بعض ایسے مسایل زیر بحث آگئے ہیں جن پر اظہار خیال نہ صرف دشوار بلکہ غیر ممکن ہے۔ بعض استفسارات کی فہرست یہ ہے :-

زحمت و تکلیف کا محل استعمال ـــ ابوریحان بیرونی ـــ نفس روح ـــ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ مولویہ ـــ ظالم نیرون ـــ مہاتما گاندھی کس فلسفہ کے متبع ہیں ـــ بچوں کی ابتدائی تعلیم ـــ لقمان ـــ مجنوں ـــ عالم برزخ ـــ یاجوج ماجوج ـــ کلیلہ و دمنہ ـــ ہاروت و ماروت، زہرہ و اسم اعظم ـــ مزوک و مزدکیت ـــ عقل و مذہب کی جنگ اور خدا سے انکار ـــ واقعۂ شق القمر ـــ ختم نبوت ـــ غوارج کی تاریخ ـــ خاتون ـــ ختنہ ـــ خطابیہ ـــ ایک لفظ اور مصرعہ کی تحقیق ـــ حدیث پر تاریخی و فنی گفتگو ـــ مذہب و مذہبیات ـــ مہدوی جماعت اور امام مہدی ـــ نور محمدی و پل صراط ـــ فارسی زبان اور طنزیات ـــ وجود روح ـــ تناسخ حاضرات ـــ حروفی طبقہ ـــ رضا شاہ پہلوی کی داستان ترقی ـــ ایک عجیب استفتاء وغیرہ وغیرہ۔

اس کی ضخامت ۹۶ صفحات اور قیمت خریداران نگار سے عہ اور غیر خریداران سے ے، علاوہ محصول۔

پہلا اور دوسرا حصہ بھی تقریباً اتنا ہی ضخیم ہے اور اُن کی قیمتیں بھی عہ فی حصہ خریداران نگار سے اور ے فی حصہ غیر خریداران نگار سے علاوہ محصول ہیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

نمرود اور جناب ابراہیمؑ —— اہلِ عرب اور تغزل

(مسٹر فضل الٰہی - کراچی)

(۱) کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو نمرود نے آگ میں پھینکدیا تھا لیکن اللہ نے انھیں بچا لیا اور آگ پھول ہوکر رہ گئی - براہ کرم مطلع فرمائیے کہ اس روایت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور کلام مجید سے اس کا کہاں تک تطابق ہوتا ہے

(۲) اُردو فارسی میں جو صورت غزل کی پائی جاتی ہے کیا وہ عربی لٹریچر میں بھی موجود ہے اور اسکی عشقیہ شاعری کا کیا انداز ہے

(نگار) آپ کا پہلا استفسار کافی طویل بحث چاہتا ہے اور چونکہ میں آج ہی ایک طویل سفر پر لکھنؤ سے باہر جا رہا ہوں اس لئے اس مسئلہ کو میں ماہ آیندہ پر اُٹھا رکھتا ہوں اور دوسرے استفسار کا مختصر جواب عرض کئے دیتا ہوں۔

اُردو فارسی میں جو صورت غزل نگاری کی پائی جاتی ہے وہ عربی زبان میں کبھی نہیں پائی گئی۔ فارسی و اُردو غزل فنی حیثیت سے ایسی چیز ہے جس میں ایک شعر کا تعلق دوسرے سے ضروری نہیں اور اہل عرب چونکہ صرف قصاید و مراثی لکھا کرتے تھے اس لئے وہ تسلسل بیان کے عادی تھے اور یہ بات کبھی ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک ہی بیت کے اندر کیونکر تمام جذبات عشق کو سمیٹا جا سکتا ہے

بہرحال مراثی کو تو چھوڑئے کہ اس میں بیان حسن و محبت کا کیا موقعہ، لیکن قصاید میں ضرور اسکی گنجایش تھی اور اس سے انھوں نے فایدہ اُٹھایا - آپ کو معلوم ہوگا کہ قصیدہ کی تمہید کو اصطلاح میں تشبیب کہتے ہیں، اسی کا دوسرا نام "نسیب" ہے - اور اسی کو آپ ان کی غزل نگاری بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اس کے علاوہ عشقیہ شاعری کا

وجود عہد جاہلیت سے لیکر عہد اسلام تک ان کے یہاں کہیں اور نہیں پایا جاتا

اس نوع کی تشبیب میں بیان حُسن وعشق کی چند مخصوص ومتعین صورتیں ان کے یہاں پائی جاتی تھیں اور اُلٹ پلٹ کر ہمیشہ انھیں کو دہرایا جاتا تھا مثلاً — ایک بدوی گھومتا پھرتا، صحرائی خاک چھانتا ہوا ایک ایسی جگہ پہونچتا ہے جہاں اسے کسی کیمپ کے نشان نظر آجاتے ہیں، وہ گڑھے دیکھ کر سمجھتا ہے کہ یہاں میخیں گاڑی گئی تھیں، مینگنیاں دیکھ کر خیال کرتا ہے کہ وہاں اونٹ باندھے گئے تھے، دھواں کھائے ہوئے پتھروں کو دیکھ کر سمجھتا ہے کہ اسی جگہ کھانا پکایا گیا تھا، اور اسی سلسلہ میں اس کا ذہن منتقل ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانہ میں ایک وقت اس کا قبیلہ بھی اس کی محبوبہ کے قبیلہ کے ساتھ صحرا میں خیمہ زن تھا اور دونوں کس لطف سے چراگاہ میں وقت بسر کرتے تھے۔ پھر اس زمانہ کی یاد میں وہ بیان کرنا شروع کرتا ہے کہ جس جگہ اس کا اور اس کی محبوبہ کا خیمہ نصب تھا وہاں کے نشانات ہوا اور بارش نے کس طرح مٹا دئے اور پھر بعد کو اسی جگہ سبزہ اُگا اور ہرنیوں نے اسے اپنی چراگاہ بنا لیا وغیرہ وغیرہ۔

بعض شعراء اسی بیان کے ساتھ محبوبہ کی جدائی کا سین بھی پیش کرتے تھے کہ صبح کو خیمے اونٹوں پر بار ہو رہے ہیں کجاوہ میں اس کی محبوبہ بیٹھتی ہے اور اسے صحرا میں تنہا چھوڑ کر چلی جاتی ہے، چنانچہ وہ یہ تمام باتیں یاد کر کر کے آہ وزاری کرنے لگتا ہے اور ماتم میں مصروف ہو جاتا ہے

پھر یہ سلسلۂ خیال آرائی اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اپنی محبوبہ کا سراپا اس کے لباس اور اس کے زیور کی تفصیل بیان کرتا ہے، اس کے سفر کا حال لکھتا ہے، کسی اور سے اس کی شادی ہو جانے اور اس کی اولاد پیدا ہونے کا بھی ذکر کرتا ہے اور آخر میں وہ اپنے دردِ جدائی اور اضطراب کے بیان پر تشبیب کو ختم کر دیتا ہے

قدیم عرب شاعری میں تشبیب کا جو انداز تھا اور جس سلسلۂ بیان کا اہتمام کیا جاتا تھا وہ بعد کو بھی بدستور قایم رہا چنانچہ آپ عہدِ جاہلیت سے لیکر عہدِ اسلام تک تمام قصاید کی نسیب کا مطالعہ کیجئے بہ لحاظ جذبات سب میں آپ کو وہی یکرنگی نظر آئے گی شاعر کیمپ کے نشانات کا ذکر کرے گا تو یہی کہے گا گویا کاغذ پر قلم سے نقوش بنائے گئے ہیں، محبوبہ کی رعنائی کے اظہار میں ہرن کی تشبیہ ضرور استعمال کرے گا، اور اپنے آنسوؤں کے متعلق یا تو یہ کہے گا کہ کسی پھٹی ہوئی چھاگل سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہیں یا یہ کہ کسی ہار کے ٹوٹے ہوئے موتی ہیں۔ لیکن چونکہ مترادفات کے لحاظ سے عربی زبان بہت زیادہ وسیع و مالدار ہے اس لئے الفاظ کے تغیر وتنوع کی وجہ سے ایک ہی مفہوم یا تشبیہ کی بار بار تکرار بُری نہیں معلوم ہوتی

تشبیب کی نوعیت اور فنی تشکیل عہد جاہلیت ہی میں قایم ہو چکی تھی اور دورِ جاہلیت کے بعد بھی کسی شاعر نے اس سے منحرف ہونے کی جرأت نہیں کی، لیکن یہ ضرور ہے کہ آہستہ آہستہ اس میں بیرنگی یقیناً پیدا ہونے لگی، درانحالیکہ بدوی عہد میں اس کی یکسانیت وہی تھی اور دیہی وشہری شاعر کے انداز میں کوئی فرق نہ پایا جاتا تھا،

چنانچہ قیس بن الخطیم، حسان بن ثابت اور عدی بن زید اپنی محبوبہ کے حسن کا بیان اور درد جدائی اسی انداز میں کرتے ہیں جس طرح امرء القیس۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عہد جاہلیت میں ایک شہر کا رہنے والا بھی بدوی معاشرت سے پوری طرح واقف تھا، لیکن بعد کو جب عہد اسلام میں شہر کے لوگ بدوی زندگی کی خصوصیات سے بے خبر رہنے لگے تو نسیب کا وہ رنگ بھی پھیکا پڑ گیا اور ہر قصیدہ کی ابتدا میں وہی ایک خیمہ و خرگاہ کا رونا رہ گیا، چنانچہ عہد عباسیہ کے ایک نقاد نے اس کو دیکھ کر کس قدر پر لطف بات کہی کہ کیا ہر وہ شخص جو شعر موزوں کر سکتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ عاشق بھی ہو اور اس کا عشق صحرا کے اسی حصہ سے شروع ہو جہاں قبایل خیمہ زن ہوتے ہیں

قصاید کی ان تشبیبوں سے ہم کو یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ عہد جاہلیت میں تعلقات محبت بڑی اہمیت رکھتے تھے، اور اُن کو انجام تک پہونچانے کے لئے مراسم نکاح کا ادا کیا جانا ضروری نہ تھا۔ اگر ایک شخص کسی عورت سے محبت کرنے لگتا تھا تو اس کے معنے یہ نہیں تھے کہ وہ محض نکاح کرنے کے لئے محبت کرتا ہے بلکہ اگر اس کی محبوبہ کی شادی کسی اور سے ہو جاتی تھی تو بھی اس کا عشق بدستور قایم رہتا تھا، بلکہ اس میں اور زیادہ فتادگی و برشتگی پیدا ہو جاتی تھی۔ اسی کے ساتھ عہد جاہلیت کے قصاید کی تشبیب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کی مواصلت زیادہ تر موسم بہار میں ہوتی تھیں جب چراگاہیں سبز ہوتی تھیں اور جب مختلف قبایل اپنے اپنے کمپ مرغزاروں میں آکر نصب کر دیتے تھے۔ اسکے بعد جب یہ موسم ختم ہو جاتا تھا اور قبایل ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے تو موسم عشق و محبت بھی ختم ہو جاتا تھا اور عاشق و معشوق دونوں پھر آیندہ موسم بہار تک تڑپنے کے لئے تنہا رہ جاتے تھے۔

رہا یہ سوال کہ تشبیب کا رواج عرب شاعری میں کب سے شروع ہوا اور قدیم ترین نسیب کونسی ہے، اس کا یقینی جواب دینا مشکل ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہلہل نے قصیدے میں نسیب کا اضافہ کیا، لیکن قصیدے سے علحدہ خالص بیان حسن و جمال مہلہل سے پہلے بھی پایا جاتا تھا، چنانچہ جب نعمان نے شاہ انوشیروان کو ایک کنیز بھیجی تھی تو اسی کے ساتھ اس کی تعریف میں ایک تحریر بھی ساتھ روانہ کی تھی

نسیب کی قسم کے عاشقانہ جذبات "نغمۂ سلیمان" میں بھی پائے جاتے ہیں اور مصر قدیم کی شاعری میں بھی ملتے ہیں

ضرورت رشتہ

ایک شریف خاندان، خوبصورت۔ شوخ دوشیزہ کی۔ جو تعلیم یافتہ تو ہو مگر آزاد خیال نہ ہو۔ والدین کی اکلوتی ہو تو اُسے ترجیح دیجائے گی۔ لڑکا شریف خاندان، خوبصورت۔ ۲۲ سال کا، بمشاہرہ ۳۵۰ سرکاری ملازم ہے۔ تصاویر کا تبادلہ بالکل ضروری ہے

و۔ ذریعہ منیجر نگار لکھنؤ

نديم آيا اور كام كركے گھر چلا گيا۔ جب تين دن تک حاضر نہ ہوا تو سلطان نے اُس کو طلب کرکے وجہ دریافت کی۔ اُس نے کہا کہ "سلطان ہمیشہ میرا نام لیکر پکارا کرتا تھا اُس دن بالکل خلاف معمول تاج الدین کہکر آواز دی میں سمجھا کہ سلطان کچھ برہم ہے بیقرار و مضطرب ہوکر گھر چلا گیا" سلطان نے قسم کھا کر کہا کہ "میں تم سے مطلق رنجیدہ نہیں ہوں اُس دن تمھارا نام نہ لینے کی وجہ یہ تھی کہ میں باوضو نہ تھا اور بغیر طہارت کامل کے لفظ محمد میں اپنی زبان سے ادا نہ کرسکتا تھا"[1]

چونکہ سلطان مذہبی زندگی کی طرف زیادہ شغف رکھتا تھا اس لئے تمام اُمور سلطنت غیاث الدین بلبن کے ہاتھوں طے پاتے تھے اور حقیقت یہی ہے کہ ناصر الدین کی کامیابی بحیثیت فرمانروا ہونے کے صرف بلبن کی قابلیت کی ممنون تھی جس نے اپنی غیر معمولی ذہانت و فراست، شجاعت و پامردی، اور نظم و نسق سے سلطان ایبک اور سلطان التمش کے عہد کو بھلا دیا

خاندانِ غلام کی تاریخ میں یہ عجیب بات نظر آتی ہے کہ جب تک حکومت و سلطنت کسی مملوک کے ہاتھ میں رہی انتظام ہمیشہ اچھا رہا اور جب وہ بادشاہ کے نسبی سلسلہ میں منتقل ہوئی تو سارا انظام درہم برہم ہوگیا۔ بلبن، سلطان التمش کا غلام بھی تھا اور داماد بھی۔ جب بیس سال سے زیادہ حکومت کرنے کے بعد سلطان ناصر الدین کا وقت آخر آیا تو غیاث الدین بلبن بادشاہ ہوا اور اس قدر قابلیت سے اُس نے حکومت کی کہ تاریخ اسلام میں بہت کم مثالیں ایسی نظر آتی ہیں

عہد ناصر الدین کے خاص خاص واقعات یہ ہیں:-

۶۴۴ھ / ۱۲۴۶ء	ناصر الدین تخت نشین ہوا اور کوہستان جودی کے رانا کے خلاف بلبن کی سرکردگی میں ایک مہم روانہ کی گئی۔ رانا نے گزشتہ سال مغلوں کی رہنمائی کی تھی
۶۴۵ھ / ۱۲۴۸ء	ناصر الدین نے مملکت قنوج میں قلعۂ نندنا (تلسندا، تلندا) کو فتح کیا اور بلبن نے رانا دلکی ملکی کو مغلوب کیا اور پھر دونوں فوجیں کڑہ کی طرف بڑھیں
۶۴۶ھ / ۱۲۴۹ء	بلبن نے رانائے رنتنبور کے خلاف فوج کشی کی اور خواجہ بہاء الدین ایبک اس جنگ میں شہید ہوا
۶۴۷ھ / ۱۲۴۹ء	ناصر الدین نے اپنی بیٹی کی شادی بلبن سے کی اور الغ خان اعظم کا خطاب عنایت کیا
۶۴۸ھ / ۱۲۵۰ء	عز الدین نے ملتان کا محاصرہ کیا جہاں شیر خاں سنقر حاکم تھا لیکن ناکامیاب رہ کر اوچہ واپس آیا
۶۴۹ھ / ۱۲۵۱ء	عز الدین نے ناگور میں بغاوت کی لیکن ناصر الدین کے پہونچنے پر اُس نے اطاعت اختیار کی

[1] فرشتہ صفحہ ۴۷

عہد خاندان غلاماں — خاص خاص واقعات کی تفصیل — غیاث الدین بلبن — اُمور سلطنت اور غیاث الدین بلبن — خصوصیت

بادشاہ مالوہ کی طرف گیا۔ راجہ ناہر دیو کو شکست ہوئی اور نرور فتح ہوا

الغ خاں نے گوالیار پر فوج کشی کی

منہاج سراج کو عہدۂ قضا تفویض ہوا

۶۵۰ھ / ۱۲۵۲ء سلطان نے اوچھ اور ملتان کے راستہ سے لاہور اور غزنین کی طرف سفر اختیار کیا اور عماد الدین ریحان نے بادشاہ کو بلبن کی طرف سے کشیدہ کر دیا

۶۵۱ھ / ۱۲۵۳ء بلبن کو اپنی جاگیر اقطاع ہانسی و کوہستان سوالک کی طرف روانگی کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد افواج شاہی اس کے خلاف روانہ کی گئیں اور ہانسی شاہزادہ رکن الدین کو دیا گیا۔ بلبن نے ناگور کو اپنا مرکز قرار دیا اور ناہر دیو کے خلاف فوج کشی جاری رکھی۔ شیر خاں نے دریائے سندھ کو عبور کیا۔

۶۵۲ھ / ۱۲۵۴ء حدود بنجور (بجنور؟) میں بادشاہ کو بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ بدایوں ہوتا ہوا دہلی واپس آیا

امراء نے بلبن کی موافقت میں بادشاہ سے مخالفت شروع کی۔ جب بادشاہ کو خبر معلوم ہوئی تو وہ دہلی سے سرہند کی طرف چلا جہاں ان سب کا اجتماع تھا لیکن جب وہ ہانسی کے قریب پہونچا تو امرائے مذکور کھرام اور کیتھل کی طرف ہٹ گئے اور وہاں فوجی مظاہرہ شروع کیا۔ آخر کار باہم صلح ہو گئی اور بلبن کی طرف سے بادشاہ کا دل صاف ہو گیا۔ اور ریحان جو باعث فساد تھا دربار سے علیحدہ کر کے بدایوں بھیجدیا گیا

۶۵۳ھ / ۱۲۵۵ء بادشاہ اپنی ماں ملکہ جہاں سے (جو حبالہ قتلغ خاں میں تھی) ناخوش ہو گیا اور دونوں کو اقطاع اودھ دے کر رخصت کر دیا۔ قتلغ خاں نے بغاوت کی لیکن الغ خاں بلبن نے اس کو پسپا کر کے کالنجر تک ہٹا دیا

۶۵۴ھ / ۱۲۵۶ء قتلغ خاں کے خلاف فوجی کارروائی جاری رہی

۶۵۵ھ / ۱۲۵۷ء عز الدین بلبن نے بغاوت کی اور سامانہ کے قریب قتلغ خاں بھی اس کا شریک ہو گیا۔ اس کے بعد یہ دونوں دہلی کی طرف بڑھے لیکن ہزیمت کھا کر واپس آئے

۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء بادشاہ مغلوں کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا جو ملتان تک پہونچ گئے تھے لیکن کوئی مقابلہ نہیں ہوا اور بادشاہ واپس آیا

۶۵۷ھ / ۱۲۵۹ء خاص عساکر سلطانی جنوب کی طرف روانہ کئے گئے۔ دار الحکومت میں امن و سکون رہا اور حاکم لکھنوتی نے خراج روانہ کیا

۶۵۸ھ / ۱۲۶۰ء | الغ خاں میواتیوں کی سرکوبی کے لئے مامور ہوا اور ہلاکو خاں (مغل) کی طرف سے ایک سفارت دہلی آگئی

۶۶۴ھ / ۱۲۶۵ء | ۱۱ جمادی الاول کو بادشاہ نے انتقال کیا

غیاث الدین بلبن

(۶۶۴-۶۸۶ھ / ۱۲۶۵-۱۲۸۷ء)

بلبن بھی ترک تھا اور اُسی سرزمین کا جہاں التتمش پیدا ہوا تھا "طائفۃ البری" اس کے قبیلہ کا نام تھا جب مغلوں نے اس حصّہ ملک کو غارت کیا تو بلبن اُن کے ہاتھ آگیا۔ ایک سوداگر نے اُس کو مول لے لیا اور بغداد میں خواجہ جمال الدین بصری کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ خواجہ اس کو سلطان شمس الدین التتمش کے پاس دہلی لایا اور سلطان نے معقول قیمت دے کر لے لیا[1]

ابن بطوطہ نے بیان کیا کہ جب بلبن سلطان شمس الدین التتمش کے روبرو لایا گیا تو اُس نے خریداری سے انکار کر دیا کیونکہ یہ بہت پستہ قامت اور بدصورت تھا۔ بلبن نے یہ معلوم کر کے سوال کیا کہ "جہاں پناہ اور غلام کس کے لئے خریدے گئے ہیں؟" التتمش نے ہنسکر جواب دیا کہ "اپنے لئے"۔ بلبن نے عرض کیا کہ "تو پھر ایک مجھے خدا کے لئے مول لے لیجئے"۔ یہ سُن کر التتمش خوش ہوا اور اس کو مول لے کر سقہ کی خدمت سپرد کر دی[2]

بلبن کی فراست

چونکہ بلبن فطرت کی طرف سے بہترین صفات و خصائل لیکر آیا تھا اس لئے اُس کا تقرب بڑھتا گیا۔ رضیہ کے عہد میں میر شکار ہوگیا اور سلطان بہرام شاہ نے اس کو میر آخور بنا دیا۔ سلطان علاء الدین مسعود کے زمانہ میں "امیر حاجب" ہوگیا اور سلطان ناصر الدین نے تو تمام اُمور سلطنت ہی اس کے سپرد کر دئے۔ یہانتک کہ سلطان ناصر الدین کے بعد بالاتفاق سب نے اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا

بلبن نے اپنا طویل زمانۂ سلطنت جس فراست و دانائی سے بسر کیا ہے اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ خصوصیات کیونکر اُسے حاصل ہوگئیں جبکہ اس کا زمانۂ تربیت کافی تکلیف و مصائب میں بسر ہوا

---

[1] فرشتہ صفحہ ۴۰

[2] Medival India by S. Lane Poole P. 78

بلبن کی فرض شناسی

ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی[1] میں لکھا ہے کہ:-

"جس زمانہ میں یہ صرف ایک سردار کی حیثیت رکھتا تھا اُس وقت وہ عیش و تفریح کی طرف مایل تھا۔ بذلہ سنج ندیم اور خوش گلو مُغنّی اُس کی محفل میں رہتے تھے اور وہ بھی بادہ خواری، قمار بازی اور اسی طرح کے دوسرے مشاغل میں مصروف نظر آتا تھا لیکن جب بادشاہ ہوا تو اُس نے اپنی زندگی کا ورق ہی اُلٹ دیا۔ نہ کہیں محفل عیش و طرب تھی نہ بزم بادہ خواری وہ حد درجہ متین و سنجیدہ ہوگیا۔ شرابخواری کو نہ خود ترک کیا بلکہ عام طور سے اُس کے استعمال کی سخت ممانعت کردی۔ نماز روزہ کا سختی کے ساتھ پابند ہوگیا، یہاں تک کہ اشراق و تہجد کی نماز بھی وہ ترک نہ کرتا تھا، ہمیشہ باوضو رہتا، بغیر علماء و صلحاء کی صحبت کے کھانا نہ کھاتا، ہمیشہ اُن سے مسائل شرعیہ دریافت کرتا رہتا اور بزرگوں کے مکانوں پر خود حاضری دیتا، لوگوں کی تعزیت کرتا، اکابر کے جنازوں میں حاضر رہتا اور اگر راستہ میں کہیں مجلس وعظ برپا دیکھتا تو تعظیماً سواری سے اُتر پڑتا اور کچھ دیر سنتا۔ یہ تھا اُس کے زہد و ورع کا عالم"[2]

انتظام سلطنت اور آداب حکمرانی

انتظام سلطنت کا اُسے اسقدر خیال تھا کہ جب تک وہ پوری طرح کسی شخص کی شرافت نفس اور اہلیت کو معلوم نہ کرلیتا اُسوقت تک اُس کو کوئی عہدہ نہ دیتا اور اگر کوئی ملازم یا حاکم صلاح و تقوے، دیانت و امانت سے منحرف ہوجاتا تو فوراً معزول کردیتا۔ کبھی رذیل اور معمولی لوگوں سے بات نہ کرتا۔ کسی ہزل گو یا مسخرہ کو دربار میں آنے نہ دیتا اور ہمیشہ نہایت سنجیدہ اور معقول لوگوں کو اپنی صحبت میں رکھتا۔ وہ قہقہہ سے کبھی نہ ہنستا تھا اور نہ کسی اور کو جرأت ہوتی تھی کہ اُس کے سامنے ہنسے[3]

فیاضی و دریا دلی

طبقات ناصری مصنفہ شیخ عین الدین بیجاپوری کے حوالہ سے فرشتہ نے لکھا ہے کہ "فتنۂ چنگیز خانی سے بھاگ کر ترکستان، ماوراء النہر، خراسان و عراق، فارس اور روم و شام وغیرہ کے پندرہ شاہزادوں نے بلبن

---

[1] ضیاء الدین برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" نہایت مشہور کتاب ہے جس سے دیگر مورخین (فرشتہ وغیرہ) نے بہت مدد لی ہے۔ یہ کتاب طبقات ناصری کے بعد لکھی گئی ــــ منہاج السراج نے سلطنت سلطان ناصر الدین محمود کے صرف پندرہ سال تک کے حالات لکھے تھے، اس کے بعد ایک صدی تک کسی مورخ نے توجہ نہیں کی آخر کار ضیاء الدین برنی کو خیال پیدا ہوا اور اس نے سلطان غیاث الدین بلبن کے حالات سے اپنی تاریخ کو شروع کرکے سلطان فیروز شاہ تغلق کے حالات پر ختم کردیا ہے ــــ چونکہ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اس نے یہ تاریخ مرتب کی تھی اس لئے اسی کے نام سے منسوب کی گئی تاریخ فیروز شاہی میں مسلسل واقعات کا لحاظ کم رکھا گیا ہے اور تاریخوں کی صحت کی طرف بھی زیادہ اعتنا نہیں کیا گیا تاہم اس لحاظ سے کہ اس عہد کی تاریخ کوئی اور مرتب نہ تھی تمام مورخین نے اس سے فایدہ اُٹھایا ــــ ضیاء الدین برنی کا آخری زمانہ نہایت افلاس و تنگدستی میں بسر ہوا اس کی قبر حضرت امیر خسرو کے مزار کے قریب ہی نظام الدین (دہلی) میں واقع ہے۔

[2] طبقات اکبری صفحات ۳۹-۴۰ ــــ [3] تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی جلد سوم صفحہ ۱۰۰

کی سلطنت میں پناہ لی تھی بلبن نے ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک محلہ الگ کر دیا تھا اور سب کے شاہانہ وظایف مقرر کر دئے تھے

دربار بلبن علماء کا مرکز تھا

چونکہ اس زمانہ میں وسط ایشیا اور اس کے جوار کے تمام صاحبانِ کمال تاتاری فتنہ سے پریشان تھے اسلئے ان کے لئے سوائے سلطنت دہلی کے اور کوئی مامن نہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ :-

"زبدہ و نخبہ و خلاصۂ عالم از اصحاب سیف و قلم و سازندہ و خوانندہ و ارباب ہنر کہ در ربعِ مسکون عدیل و نظیر نہ داشتند در درگاہِ بلبن جمع شدہ بودند و درگاہِ او را بر درگاہِ محمودی و بخاری ترجیح می دادند"[1]

عدل پروری

بلبن کی عدل پروری کا یہ عالم تھا کہ وہ انصاف کے معاملہ میں کسی کی رعایت نہ کرتا تھا اور نہ کسی کی سفارش کو مانتا تھا۔ اس نے اپنے لڑکوں سے صاف صاف کہدیا تھا کہ اگر کبھی تمہاری طرف سے ظلم و ستم ظاہر ہوگا تو میں بغیر سزا دئے ہوئے نہ چھوڑوں گا

بلبن کے نصائح

جو نصیحتیں وہ اپنی اولاد کو سناتا تھا اُس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کن اُصول پر حکمرانی کرنا چاہتا تھا۔ اُسنے ایک بار اپنے بیٹوں سے کہا کہ "دیکھو ایک بادشاہ کی نجات چار باتوں پر منحصر ہے ایک یہ کہ وہ خدا سے ڈر کر رعایا کے آرام و سکون کا انتظام کرے۔ دوسرے یہ کہ فسق و فجور کا ملک سے استیصال کلی کر دے۔ تیسرے یہ کہ خدمات حکومت ہمیشہ خداترس، امین اور شائستہ لوگوں کے سپرد کرے۔ چوتھی بات یہ کہ ظلم و ستم نہ ہونے دے اور انصاف کرنے میں کسی کی رعایت نہ کرے"

انصاف کی مثالیں

ایک بار ملک نعیق پسر جامدار نے جو امراء کبار میں سے تھا اور ولایت بدایوں اُس کی جاگیر میں تھی حالت مستی میں ایک فراش کو اسقدر دُرّے مارے کہ وہ مر گیا۔ جب سلطان بلبن بدایوں پہونچا تو فراش کی بیوی دربار عام میں حاضر ہوئی۔ سلطان بلبن نے اُسی وقت سب کے سامنے ملک نعیق کو طلب کیا اور اس قدر دُرّے لگوائے کہ وہ بھی مر گیا اور بدایوں کے بریدوں (پرچہ نگاروں) کو جنھوں نے اس واقعہ کی اطلاع اُسے نہیں دی تھی شہر کے پھاٹک پر سولی دیدی

دوسری مثال

اسی طرح ایک بار ہیبت خاں نے جو سلطان بلبن کے نہایت معتبر غلاموں میں سے تھا اور اقطاع اودھ جاگیر میں رکھتا تھا ایک شخص کو حالتِ مستی میں مار ڈالا۔ اُس کی بیوی سلطان کے پاس فریاد لائی۔ سلطان نے ہیبت خاں کو طلب کر کے پانچسو دُرّے لگوائے اور عورت سے کہا کہ "ہیبت خاں آج تک میرا غلام تھا لیکن آج سے تو اس کی مالک ہے۔ تجھے اختیار ہے چاہے مار ڈال چاہے معاف کر دے" بمشکل تمام ہیبت خاں نے بیس ہزار تنکہ

---

[1] فرشتہ۔ صفحہ ۷۵

دے کر اُس عورت کو راضی کیا اور نجات پائی۔[1]

سلطان بلبن نے اپنی سلطنت کے صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے کثرت سے جاسوس یا برید مقرر کر دئے تھے اور وہ نہایت سختی سے احتساب کیا کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ نہ جاسوس کوئی غلط خبر اُس تک پہونچا سکتا تھا اور نہ حکام کو جادۂ اعتدال سے ہٹنے کا یارا تھا

بلبن نے تخت نشین ہوتے ہی جس طرف توجہ کی وہ سپاہ تھی اس نے تمام فوج کا جایزہ لیا اور کمان ایسے ہاتھوں میں دی جن کی وفاداری مسلم تھی۔ بلبن اپنی سلطنت میں دورہ بھی کثرت سے کیا کرتا تھا اور خود انتظامی حالات کو دیکھکر اُن میں اصلاحیں کیا کرتا تھا۔ ہر چند وہ نظم و نسق کے باب میں بہت سخت تھا لیکن پھر بھی وہ بہت رحم و کرم کرتا اور ضعفاء کا بہت خیال رکھتا۔ ایک بار بلبن کو معلوم ہوا کہ عہد شمسی (شمس الدین التمش) کے بہت سے سپاہی ضعیف ہو کر بیکار ہو گئے ہیں۔ بلبن نے حکم دیا کہ جو مواضعات اُن کے پاس ہیں خالصہ میں لے لئے جائیں اور ہر ایک کے لئے تیس تنکہ بطور مدد معاش کے مقرر کر دیا جائے اس سے ان لوگوں میں سخت اضطراب پیدا ہو گیا اور سب کے سب ملک فخر الدین کوتوال کے پاس روتے ہوئے آئے۔ کوتوال ملول و مضمحل سلطان کی خدمت میں گیا اور دریافت کرنے پر عرض کی کہ "جہاں پناہ نے ضعفاء کو اپنے رحم و کرم سے محروم کر دیا ہے اگر خدا نے قیامت کے دن بھی اسی طرح ہم ضعیفوں کو مردود کر دیا تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟" یہ سن کر سلطان بلبن بہت رویا اور فرمایا کہ "نہج سابق پر سب کی معاش بحال رکھی جائے اور آیندہ کوئی تعرض نہ کیا جائے"[2]

سفر کے دوران میں اگر کسی پُل، گھاٹ یا گزرگاہ عام پر پہونچ جاتا تو اپنے سرداروں کو مقرر کرتا کہ سب سے پہلے عورتوں، بچوں، ضعیفوں اور کمزور جانوروں کے گزر جانے کا انتظام کریں اور پھر دوسرے لوگ عبور کریں۔

سلطان بلبن کبھی اس کو گوارا نہ کرتا کہ کوئی شخص اُس کی سلطنت میں بغاوت یا نقضِ امن کا مجرم ہو۔ وہ مفسدوں اور باغیوں کو سخت سزائیں دیتا اور خود فوج لیجا کر سرکوبی کرتا۔ طغرل کی بغاوت میواتیوں کی شورش اس کے عہد کے خاص واقعات ہیں۔ پھر بلبن نے جس طرح ان فتنوں کو فرو کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاست میں بھی وہ خاص ملکہ رکھتا تھا

بلبن کو شکار کا بھی بہت شوق تھا۔ دہلی کے چاروں طرف بیس بیس کوس تک کا جنگل شکار کے لئے مخصوص کر لیا تھا اور جاڑوں میں روزانہ صبح کو ہزار سواروں کی جمعیت لے کر نکل جاتا اور رات کو واپس ہوتا۔ علاوہ سواروں کے ایک ہزار سپاہ پیادہ فوج کی بھی ہوتی جب ہلاکو کو بغداد میں یہ خبر معلوم ہوئی کہ سلطان بلبن شکار کا اسقدر شایق ہے

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی جلد سوم صفحہ ۱۰۱ — [2] فرشتہ صفحہ ۷۸، تاریخ فیروز شاہی جلد سوم صفحہ ۱۰۸

تو اُس نے کہا کہ بلبن معلوم ہوتا ہے بڑا تجربہ کار اور ہوشیار بادشاہ ہے۔ وہ بظاہر شکار کو جاتا ہے لیکن اس سے مقصود یہ ہے کہ اس کے سپاہی اور گھوڑے محنت کے عادی رہیں اور خطرہ و ضرورت کے وقت اچھا کام دے سکیں[1]

سلطان غیاث الدین بلبن اپنے تمام صفات رحم و کرم، بذل و نوال کے ساتھ سطوت و جبروت بھی بدرجۂ اتم قایم رکھتا تھا اور لوگوں کے دلوں میں اس نے اپنی ہیبت و عظمت بہت قایم کر رکھی تھی۔ تخت نشینی کے دوسرے سال جب اس نے جلوس نکالا تو سیکڑوں کوس سے لوگ دیکھنے کے لئے جمع ہوئے اور اس قدر تزک و احتشام کی نمایش کی گئی کہ دنیا متحیر تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے قبل کسی بادشاہ نے اس شان و شوکت کا اظہار نہیں کیا

وہ اپنی خانگی زندگی میں بھی اس کا لحاظ رکھتا تھا کہ کوئی خادم گستاخ نہ ہو جائے اور اس لئے وہ کبھی کسی سے بے تکلف ہو کر نہ ملتا تھا اس کے بعض ایسے خادم جو ہر وقت خلوت میں ساتھ رہتے تھے اُن کا بیان ہے کہ ہم نے کبھی بادشاہ کو خلوت کے نصف لباس میں نہیں دیکھا ہمیشہ وہ اپنے پورے ملبوس میں نظر آتا تھا[2]

بلبن کے بڑے بیٹے کا نام محمد سلطان تھا جو بعد کو خان شہید کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی تعلیم و تربیت کے انتظام میں بلبن نے نہایت احتیاط سے کام لیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مکارم اخلاق اور محاسن اوصاف میں وہ اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ فضیلت دانش و ہنر میں بھی وہ بے مثل شخص تھا اور اس کا دربار علماء و فضلا کا مرکز تھا۔ صاحبان فضل و کمال اور شعراء عصر ہر وقت اس کے پاس جمع رہتے اور وہ اپنی شاہانہ بخشش سے سب کو مالامال کر دیتا۔ حضرت امیر خسرو جن کی ذات پر ہندوستان کو فخر حاصل ہے اور خواجہ حسن جو بہترین شعراء میں سے تھے اسی شاہزادہ کے دربار کے جواہر تابندہ میں سے تھے۔ محمد اس قدر مہذب تھا کہ مجلس میں بعض اوقات پورا ایک ایک دن ایک ایک رات بسر ہو جاتی لیکن اپنا زانو بلند نہ کرتا۔ وہ قسم نہ کھاتا اور اگر کبھی ضرورت ہوتی تو صرف "حقا" کہدیتا۔ عمر بھر اس کی زبان سے کوئی ناملائم لفظ نہیں نکلا۔ اس کی مجالس میں زیادہ تر شاہنامہ، دیوان خاقانی و انوری خمسۂ نظامی اور اشعار امیر خسرو پڑھے جاتے۔ حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں کہ:-

"بہ جدتِ طبع و دریافت معنیِ دقیق و سخن شناسی و یادداشت اشعار متقدمین و متاخرین ہیچ محمد سلطان کم کسے را دیدہ ام"

محمد سلطان کے پاس ایک بیاض تھی جس میں اُس نے بیس ہزار اشعار قدماء کے انتخاب کئے تھے امیر خسرو اور خواجہ حسن کا بیان ہے کہ "اس سے بہتر انتخاب کوئی دوسرا کر ہی نہ سکتا تھا" جب محمد سلطان شہید ہوا تو اس بیاض کو سلطان بلبن نے امیر علی جامدار کے سپرد کیا اور پھر یہاں سے حضرت امیر خسرو کے پاس پہونچی اور اُس

---

[1] تاریخ فیروز شاہی جلد سوم صفحہ ۱۰۳ — [2] تاریخ فیروز شاہی جلد سوم صفحہ ۱۰۰

بہت سے صاحبانِ ذوق نے اشعار کا انتخاب کیا

بزرگوں کا احترام

اقامتِ ملتان کے زمانہ میں شیخ عثمان ترمذی جو اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ و درویش تھے تشریف لائے۔ محمد سلطان نے تحائف پیش کرکے اقامتِ ملتان کی درخواست پیش کی اور ایک خانقاہ تعمیر کرا کے دیہات وقف کر دینے کا وعدہ کیا لیکن شیخ نے قبول نہ کیا

سوزِ دل

اگر اس کی مجلس میں احیاناً کوئی شعر ایسا پڑھ دیتا جس میں کوئی پند و نصیحت ہوتی تو سارے کام چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہو جاتا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ ایک بار صحبت سماع برپا تھی شیخ عثمان اور شیخ صدرالدین بن شیخ بہاءالدین ذکریا بھی موجود تھے کسی شعر پر ان لوگوں کو رقت طاری ہوئی تو سلطان محمد فرط تاثر سے بیتاب ہو گیا اور ان حضرات کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو کر زار زار رونے لگا

شیخ سعدی کی طلبی

سلطان محمد نے دو بار اپنا خاص آدمی اور قیمتی تحائف شیخ سعدی شیرازی کے پاس بھیجکر ملتان آنے کی درخواست کی لیکن شیخ نے اپنی ضعیفی کا ذکر کرکے معذرت چاہی اور کہلا بھیجا کہ امیر خسرو وہاں موجود ہیں اُنکی قدردانی فرمائی جائے"

عہدِ سلطانی کی شہادت

افسوس ہے کہ قبل بادشاہ ہونے کے شاہزادہ کو مغلوں نے شہید کر ڈالا ورنہ بلبن کے بعد اس کا عہد یقیناً عجیب و غریب برکت ثابت ہوتا اور نہیں کہا جا سکتا کہ پایۂ تخت دہلی کی شہرت کس حد تک پہونچ جاتی۔[1]

بلبن کے عہد میں اور بھی بڑے بڑے صاحب کمال موجود تھے مثلاً شیخ فریدالدین مسعود شکر گنج، شیخ المشیوخ بہاءالدین زکریا، شیخ صدرالدین بن شیخ بہاءالدین، شیخ بدرالدین غزنوی، خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور سید مولہ وغیرہ کہ ان میں سے ہر ایک بے مثل شخص تھا[2]

علاوہ مشائخ و علماء کے اور لوگ بھی خاص خاص صفات کے موجود تھے مثلاً ایبک کشلی خاں جو تیر اندازی نیزہ بازی اور دیگر فنونِ حرب میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ اسی طرح بلبن کا برادرزادہ علاءالدین محمد بن اعزالدین جو مجلس آرائی اور بخشش و کرم میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ مصر و شام، روم و بغداد، عراق و خراسان وغیرہ سے شعراء اور اکابر علماء آتے تھے اور اس کے بذل و نوال سے بہرہ مند ہو کر نہایت مطمئن و مسرور واپس جاتے تھے

دیگر علماء و فنون

ایک بار خواجہ شمس الدین اور خواجہ معین الدین قطب الدین حسن غوری کے ندیم خاص نے چند اشعار علاءالدین کی مدح میں کہکر مغنیوں کو یاد کرا دئے اور تاکید کر دی کہ تقریب نوروز (جشن بلبنی) میں ان کو گا کر سنائیں جب جشن منعقد ہوا تو مطربوں نے وہی اشعار مدح سنائے علاءالدین بھی موجود تھا۔ یہ سن کر مجلس سے اُٹھ گیا اور گھر پہونچکر

---

[1] تاریخ فیروز شاہی جلد سوم صفحہ ۱۱۰۔ فرشتہ صفحہ ۷۹ — [2] فرشتہ صفحہ ۸۳

دریافت کیا کہ یہ اشعار کس کے تھے۔ چنانچہ خواجہ شمس الدین کو طلب کرکے مجلس نوروز کا تمام سامان و اسباب جو اُسنے اپنے لئے ترتیب دیا تھا اُٹھا کر خواجہ شمس الدین کو دیدیا اور دس ہزار تنکہ مطربوں کو بلا کر دیا۔ اس کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ آخر وقت میں اس کے پاس سوائے اُس کپڑے کے جو اُس کے جسم پر تھا ایک چیز بھی باقی نہ رہ گئی تھی۔[1]

امرائے بلبنی کی فیاضیاں

بلبن نے جو۔ پہلے ایک معمولی غلام تھا اور پھر بھشتی ہوگیا اور اس کے بعد رفتہ رفتہ ترقی کرکے میر شکار، میر آخور، جنرل اور وزیر کے درجہ تک پہونچا بہ حیثیت بادشاہ اور وزیر ہونے کے چالیس سال تک ہندوستان پر حکومت کی اور اس میں شک نہیں کہ اس کا زمانہ عجیب خیر و برکت کا زمانہ تھا، انتظام سلطنت، عدل و انصاف، بیدار مغزی و دور اندیشی، رحم و کرم، علم پروری، ہنر شناسی الغرض ہر اعتبار سے سلطان بلبن اپنا جواب نہ رکھتا تھا رعایا مسرور و مطمئن تھی، عمال امین و متدین تھے۔ علماء و فضلا، شعراء و مشائخ کا ہجوم تھا۔ علم و فضل کا چشمہ ہر جگہ سے اُبلتا ہوا نظر آتا تھا ملک میں ہر جگہ امن و سکون کی حکومت تھی۔ تمام ایشیا کے بڑے بڑے شاہزادے، امراء اور شعراء دربار کی رونق بڑھا رہے تھے اور حضرت امیر خسرو کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ "اس وقت بخارا بھی جو وسط ایشیا کا بہت بڑا مرکز علم و ہنر تھا دہلی پر رشک کر رہا تھا"

حکومت بلبن پر ایک عمومی تبصرہ

مسٹر لین پول کی رائے ہے کہ سلطان بلبن سے زیادہ کسی بادشاہ نے نہیں سمجھا کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہوسکتا ہے اور یہاں کی رعایا کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے[2]

فراست و دانائی

غیاث الدین بلبن کی تمام سیاسی زندگی ایک مرقع ہے اُس جرأت و بسالت و فراست و دانائی کا جو نہ صرف غلام خاندان بلکہ تمام مسلم فرمانروایان ہند میں بہت کم نظر آتا ہے

ناصر الدین محمود شاہ کی تخت نشینی کے وقت اس کی عمر صرف سترہ سال کی تھی

اس نے مسلسل بیس سال تک ناصر الدین محمود شاہ کی جس محنت و صداقت سے خدمت انجام دی اُسکی اہمیت اسوقت بہت بڑھ جاتی ہے جب دیکھا جاتا ہے کہ وہ زمانہ کس سازش و بغاوت کا تھا اور مغلوں نے حکومت ہند کے قیام کو کس قدر دشوار بنا دیا تھا۔ ناصر الدین ایک درویش صفت بادشاہ تھا۔ قرآن مجید لکھ کر اپنی معاش بہم پہونچاتا تھا اور اُس کی اکیلی بیوی بغیر اس کے کہ کوئی خادمہ اُس کی مدد کرے کھانا پکایا کرتی تھی وہ ایک فیاض طبیعت فاضل شخص تھا اور ہمیشہ علماء و حکما کی صحبت پسند کرتا تھا لیکن ساتویں صدی کے پر آشوب عہد کے لئے وہ یقیناً کسی طرح موزوں نہ تھا جب کہ ہندوستان کو ایک نہایت ہی سخت گیر، جنگجو اور سیاست داں بادشاہ کی ضرورت تھی پھر باوجود ان صفات کے فقدان کے جو کامیابی ناصر الدین کو حاصل ہوئی اُس کی وجہ صرف یہی تھی کہ بلبن اس کا دست راست تھا اور اس نے ساری سلطنت کو اپنی مٹھی میں کر رکھا تھا

ناصر الدین محمود شاہ کی وفات

---

[1] تاریخ فرشتہ صفحہ ۸۰ — [2] Medieval India by Lane Poole

مغلوں کے حملہ کا اندفاع - باغیوں کی سرکوبی - بلبن کی سخت گیری کے اسباب - قزاقوں کا انتظام - قلعوں اور سرحدی تھانوں کی تعمیر - ترک جاگیرداروں کا انتظام

اس وقت ہندوستان کی اندرونی حالت بھی ہندؤں کی بغاوتوں سے خطرناک تھی اور مغلوں کے حملوں نے اور زیادہ اُسے ہولناک بنادیا تھا لیکن یہ بلبن ہی کا دماغ تھا جس نے بیک وقت ان دونوں کا انسداد کردیا اُدھر پنجاب کی طرف شیر خاں اپنے برادر عم زاد کو متعین کرکے مغلوں کی پیشقدمی روک دی اور اِدھر اندرون ملک میں باغیوں کی ایسی سخت سرکوبی کی کہ اُن کے حوصلے بالکل پست ہوگئے۔ علاوہ اس کے ایک اور مصیبت ترک امراء کی بھی تھی جن کی سازشوں اور بغاوتوں نے سلطنت کی بنیاد کو متزلزل کر رکھا تھا، مگر بلبن ان کا بھی حریف غالب ثابت ہوا اور کامل بیس سال تک اس نے ناصرالدین کی سلطنت کو اسقدر حسن انتظام کے ساتھ چلادیا کہ تاریخ، مشکل سے ایسی دوسری نظیر پیش کرسکتی ہے

جب ناصرالدین کے بعد خود اس کا عہدِ سلطنت شروع ہوا، تو حالات بدستور تھے، ترک خوانین اب بھی موقع کے منتظر تھے، ہندو بغاوتیں کرنے کے لئے صرف ذرا سا بہانہ چاہتے تھے۔ قرب وجوار کے لٹیرے دہلی کے دروازہ تک آکر لوگوں کو پریشان کیا کرتے تھے، اور سب سے زیادہ یہ کہ مغلوں کی جماعتیں سرحد پر منڈلا رہی تھیں، اس لئے اگر اس نے سختی سے کام لیا تو وہ معذور تھا اور اس کو بہ حیثیت ایک دانشمند فرمانروا کے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا

اس نے اپنی آہنی تدبیروں سے قرب وجوار کی لوٹ مار کا سدِباب کیا اور دہلی کے نواح میں جسقدر گاؤں آباد تھے اُن میں عسکرِ سلطانی نے گھس گھس کر قزاقوں کو گرفتار کیا، جنگلوں کو صاف کیا اور تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کی قربانی کرکے ان غارتگروں کی کمین گاہ کو پُرامن قابل زراعت ضلع میں تبدیل کردیا

اس نے تمام ایسے مقامات میں جہاں فتنہ پردازوں کو فساد پیدا کرنے کا موقع ملتا تھا، قلعے تعمیر کرائے، چوکیاں قائم کیں اور اس طرح تمام اُن راستوں کو صاف اور پُرامن بنادیا جو بقول ضیاء برنی، ساٹھ سال سے قزاقوں کا مسکن بنے ہوئے تھے، اور لوگوں کی آمد ورفت وہاں مسدود تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ انتظام نرمی وآسانی سے نہ ہوسکتا تھا اس لئے جب بلبن کو کسی ایسے گروہ کا پتہ چلا تو وہ فوراً شیر کی طرح وہاں پہونچ گیا اور شیر ہی کی طرح دشمنوں اور فتنہ برپا کرنے والوں کو پارہ پارہ کردیا۔ اس غرض سے اس نے بہت سے جنگل کٹواکر سڑکیں بنوادیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ تدبیر اس کی بہت کارگر ہوئی

دوسرا مرحلہ ترک جاگیرداروں کا تھا جو جاگیروں پر اپنا موروثی حق قایم کئے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ سب بلبن ہی کی قوم وقبیلہ کے تھے اور انھیں "چہلگانی" امراء سے تعلق رکھتے تھے، جن کا ایک فرد خود بلبن بھی تھا، لیکن بلبن نے مطلقاً ان کی رعایت نہیں کی اور بڑی حد تک ترک امراء کے خودسرانہ اقتدار کو گھٹادیا حتےٰ کہ شیر خاں کو بھی جو خود اسی کا بنایا ہوا تھا اس نے فنا کردینے میں کوئی تامل نہیں کیا

تیسری خلش مغلوں کے حملہ کی تھی، چنانچہ بلبن نے اس غرض سے ایک بڑی زبردست اور مہذب فوج

مرتب کی اور اکثر و بیشتر دارالحکومت میں اپنا وقت صرف کیا، تاکہ وہ پوری طرح اپنی مرکزی قوت سے مغلوں کا مقابلہ کر سکے اگر وہ کبھی اس طرف کا رُخ کریں یہی سبب تھا کہ اپنی ساری حکومت میں اس نے دور دراز مقام کی صرف ایک مہم (بنگال) اختیار کی، جہاں عرصہ سے لوگ آمادہ بغاوت تھے اور حاکموں کا اقتدار قریب قریب اُٹھ چکا تھا

بختیار خلجی کے بعد سے پندرہ گورنر وہاں حکمران رہ چکے تھے لیکن چونکہ دہلی سے بنگال بہت دور واقع تھا اس لئے مرکز حکومت کا اثر وہاں بہت کمزور تھا۔ جسوقت غیاث الدین بلبن تخت نشین ہوا تو طغرل (بلبن کا محبوب ترین غلام) بنگال کا گورنر تھا۔ اس کو اوڑیسہ کی طرف بہت کامیابی ہوئی اس لئے کچھ تو وہاں کی دولت سے بدمست ہو کر اور کچھ یہ خیال کر کے کہ بلبن مغلوں کے خلاف اپنی تدابیر میں مصروف ہے اس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

بلبن نے ایک فوج اُس طرف روانہ کی لیکن طغرل نے تلوار اور دولت دونوں کی قوت سے کام لیکر کامیابی حاصل کی اور افواج دہلی کے اکثر سپاہی بھاگ نکلے۔ بلبن جو اس نوع کے مناظر سے آشنا نہ تھا، یہ خبر سن کر سخت برافروختہ ہوا اور اُس نے فوج کے جنرل ایتگین کو اودھ میں سولی دیکر اپنا غصہ فرو کیا۔ اس کے بعد اُس نے دوبارہ فوج روانہ کی لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوئی، اب بلبن کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ خود وہاں جائے، چنانچہ اُس نے شہزادہ محمد کو تو مغلوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے دہلی میں چھوڑ دیا، اور خود اپنے دوسرے بیٹے بغرا خاں کو ساتھ لیکر باوجود اس کے کہ بارش سخت تھی لکھنوتی کا عزم کر دیا۔ کہیں اس نے دریاؤں کو کشتیوں کے ذریعہ سے عبور کیا کہیں کیچڑ پانی میں یونہی گھوڑا ڈال کر لبریز سیدانوں اور وادیوں کو طے کیا۔ الغرض عجیب و غریب اسکندرانہ عزم کے ساتھ اس نے کوچ کیا، حتےٰ کہ لکھنوتی پہونچ گیا۔ یہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ طغرل مع اپنی فوج اور ذخائر کے جاجنگر بھاگ گیا ہے۔ بلبن اس سے اور زیادہ برہم ہوا اور عہد کیا کہ "میں دہلی کا اُسوقت تک نام بھی نہ لوں گا جب تک کہ باغیوں کا اچھی طرح خون نہ بہالوں"۔ چنانچہ طغرل بیگ کا تعاقب کیا گیا اور کچھ عرصہ تک مطلق پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔ چند دن بعد اتفاق سے بلبن کے ایک دستۂ فوج کو بنجاروں کا ایک قافلہ ملا جو طغرل کے لشکر سے واپس آرہا تھا۔ اس سے سارا پتہ معلوم ہوا اور چالیس سپاہیوں کے "مقدمۃ الجیش" نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ دشمن کے سپاہی اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ کوئی کپڑے دھو رہا ہے، کوئی گا بجا رہا ہے، ہاتھی گھوڑے اِدھر اُدھر چر رہے ہیں۔ اس دستہ نے خیال کیا کہ اگر اصل فوج کو خبر کی گئی تو اُسوقت تک طغرل یہاں سے کوچ کر جائے گا اس لئے اُنھوں نے تلواریں نیام سے نکال لیں اور سیدھے طغرل کے خیمہ میں حملہ کر دیا۔ طغرل یہ ہنگامہ سنکر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور بھاگا لیکن دریا عبور کرنے سے پہلے گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔

اس کے بعد وہ وقت آیا کہ بلبن اپنے عہد کو پورا کرتا چنانچہ اس نے بازار لکھنوتی کے دونوں جانب سولیاں قایم کیں اور طغرل کے جتنے اعزہ و شرکاء اور سپاہی ہاتھ آئے سب کو دار پر کھینچ دیا۔ دو دن تک یہی ہنگامۂ دار و گیر قایم

رہا اور طرفداران طغرل میں سے اگر کوئی گدا بھی نظر آیا تو وہ بھی اس مصیبت سے نہ بچ سکا۔ ضیاء برنی کا بیان ہے کہ "جس سختی کے ساتھ بلبن نے ان لوگوں کو سزا دی اُس کی نظیر اس سے قبل کبھی نظر نہیں آئی"۔

بلبن جب اس سے فارغ ہوا تو اُس نے اپنے بیٹے بغراخاں کو بلاکر، یہاں کا گورنر مقرر کیا اور حلف لیا کہ وہ تمام بنگال کو اپنے قبضہ میں لاکر ہمیشہ اطاعت کرتا رہے گا۔ اس کے بعد اس نے شاہزادہ سے پوچھا "کیا تم نے دیکھا؟" وہ اس سوال کا مطلب نہ سمجھا۔ دوبارہ پھر یہی پوچھا تو وہ اس مرتبہ بھی خاموش و متحیر رہا۔ تیسری بار پھر بلبن نے یہی سوال اور اسی کے ساتھ یہ تفصیل بھی بیان کی کہ "تم نے دیکھا جو سزائیں میں نے باغیوں کو دی ہیں۔ اگر کبھی تم نے حکومت دہلی سے انحراف کیا تو یاد رکھو کہ تمھارا حشر بھی وہی ہوگا، جو تم نے ابھی بازار لکھنوتی میں دیکھا"۔

بلبن کی نصیحت

اس تنبیہ کے بعد بلبن تو دہلی واپس چلا آیا اور تقریباً نصف صدی تک بغراخاں اور اس کی اولاد نے بنگال میں حکومت کی، درانحالیکہ "غلام خاندان" کی حکومت دہلی میں بلبن کے تین سال بعد ہی ختم ہوگئی

بلبن کا انتقال

بنگال کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد بلبن کی زندگی اس کے بیٹے محمد کی شہادت سے جو مغلوں کا مقابلہ کر رہا تھا بے لطف ہوگئی تھی اور ہر چند وہ دن بھر انتظاماتِ سلطنت میں بغیر کسی اظہار تاثر کے مصروف نظر آتا تھا لیکن رات کو وہ مضطرب ہوجاتا تھا اور آخر کار چار سال کے بعد ہی وہ بھی اس دنیا کو چھوڑ کر اپنے بیٹے سے جاملا۔

بلبن نے بہ حیثیتِ شاہ و وزیر، چالیس سال تک ہندوستان پر حکومت کی اور یہ نصف صدی کا زمانہ ہندوستان کی تاریخِ اسلام میں بہت عروج و اقبال کا زمانہ سمجھا جاتا ہے

معزالدین کیقباد

(سنہ ۶۸۶-۶۸۹ھ / ۱۲۸۷-۱۲۹۰ء)

بقول لین پول، بلبن انھیں لوگوں میں تھا جو اپنے بعد کوئی جانشین نہیں چھوڑ جاتے خود اس کا خیال یہ تھا کہ اپنے بعد محمد کو جانشین کر جائے گا لیکن جب وہ شہید ہوگیا تو اس نے بغراخاں کو طلب کیا لیکن اس نے بنگال کی پُرتعیش زندگی کو چھوڑنا گوارا نہیں کیا اس لئے بلبن نے برہم ہوکر محمد کے بیٹے کیخسرو کو نامزد کر دیا۔

کیقباد کی تخت نشینی

جب بلبن کا انتقال ہوا تو امراء نے کیخسرو کو نظر انداز کر دیا اور بغراخاں کے بیٹے کیقباد کو تخت نشین کر دیا یہ ایک اچھے اخلاق کا شاہزادہ تھا لیکن اس کی پرورش اسقدر خلوت میں ہوئی تھی کہ وہ سوائے لطف و تفریح کے

پھر، اب وقت آگیا ہے کہ ہم، تمام بسنے والی دنیاؤں کی عورتیں اپنی آزادی حاصل کرنے کے لئے کمربستہ ہوجائیں تاکہ آیندہ جو نسلیں ہمارے بعد آنے والی ہیں وہ صحیح معنے میں بیباک و جری پیدا ہوں۔ یاد رکھو کہ اگر دنیا میں عورت نے آزادی حاصل کرلی تو مرد نہ کبھی بوڑھا ہوگا نہ بیمار، یاد رکھو کہ دنیا اس وقت تک غلامی کی بلا سے نجات نہیں پاسکتی، جب تک عورت آزاد نہیں ہے، اس لئے اُٹھو اور آگے بڑھو اس عزم کے ساتھ کہ جو قدم آگے پڑا ہے وہ پیچھے نہ ہٹے گا اور جو نگاہیں سامنے دیکھ رہی ہیں وہ پھر پیچھے پلٹ کر نہ دیکھیں گی"

اے میری بہنو، آفرینش نام آزادی کا ہے، اور اگر خدا آزاد ہے تو تم کو بھی آزاد ہی رہ کر زندہ رہنا ہے۔ وہ آزادی جو فضا میں طیور کو حاصل ہے، میدانوں میں دریاؤں کو میسر ہے، اور ایتھر میں برقپاروں کے اندر پائی جاتی ہے

ریب و شک کی منزل سے اب گزر جانا چاہئے پس و پیش و تذبذب کو دور کردینا چاہئے اور یہ سمجھ کر آگے قدم بڑھانا چاہئے کہ جن زنجیروں میں ہم جکڑے ہوئے ہیں انھیں اب ٹوٹ کر رہنا ہے، جس قفس میں ہم زندگی بسر کررہے ہیں اس کی تیلیوں کو پارہ پارہ ہوجانا ہے۔ بڑھو اس بے خوفی کے ساتھ جو ایک شیرنی میں پائی جاتی ہے، اس قوت کے ساتھ جو تیر از کمان جستہ میں نظر آتی ہے اور اس سرعت کے ساتھ جو سورج کی کرنوں کو حاصل ہے

دنیا میں صرف ایک ہی صداقت پیدا کی گئی ہے جس کا نام آزادی ہے۔ اور جو قوتیں آزادی سلب کرنے والی ہیں وہ شیطانی قوتیں ہیں جن کا مقابلہ نہ کرنا نہ صرف اس وعدۂ ازل کی توہین ہے جو روحِ انسانی نے پروردگار عالم کے سامنے کیا تھا، بلکہ خود خدا کی توہین ہے جس کی برداشت ممکن ہے مرد کا کلیجہ کرسکے لیکن ہم عورتوں کا نازک دل اس کی تاب نہیں لاسکتا"

دلآرام کی اس تقریر نے حاضرین میں عجیب و غریب جوش پیدا کردیا اور ہر طرف سے "نعرۂ آزادی" بلند ہونے لگا، عورتیں ایک دوسرے سے گلے مل مل کر فرط مسرت سے آبدیدہ ہوگئیں اور مردوں نے اپنے سر اُنکے قدموں پر جھکادئے۔

باب (۷)

دوست پرست

دوست پرست جو قسطنطنیہ کا طالب علم تھا، "اتحاد مابین سیارگاں" کا بڑا پُرجوش حامی تھا۔ اول اول جب اس نے اس موضوع پر گفتگو کی تھی تو میں اسی وقت اس کی طرف مایل ہوگیا تھا اور معلم اکبر بھی اس کے اس

خیال کی بہت تعریف کرتا تھا

اس کے بعد جب جامِ زر اور دلآرام نے "مملکت متحدۂ سیارگاں" کی تجویزیں پیش کیں تو پھر ہر حلقہ میں ہر جگہ یہی ذکر تھا اور ہر ہر فرد سوچ رہا تھا کہ کیونکر ان تحریکوں کو عملی صورت دیجا سکتی ہے۔

دوست پرست کی تجویز بہت زیادہ عملی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ تمام سیاروں کے درمیان باہمد گر تبادلۂ خیال و مراسلت کا ذریعہ بھی پیدا کیا جائے جس کو وہ بالکل قابل عمل سمجھ کر تیقنات ریاضی میں شمار کرتا تھا۔

وہ کہتا تھا کہ مختلف کروں میں بعض ایسی ہستیاں پائی جاتی ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ رابطۂ روحانی رکھتی ہیں چنانچہ خود اپنے کرے میں بھی وہ بعض ایسی ہستیوں کے وجود کا یقین رکھتا تھا۔ اس نے بیان کیا کہ وہ ان سے ملا تھا اور انھوں نے بتایا کہ اب مختلف کروں کے درمیان سلسلۂ پیام رسانی جاری ہے۔

دوست پرست اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ کائنات میں ایسی برقی شعاعیں پوشیدہ ہے جن سے یہ کام لیا جا سکتا ہے اور ہر چند عام طور پر اس کا علم لوگوں کو حاصل نہیں ہے لیکن جلد وہ وقت آنے والا ہے جب ان شعاعوں کی اس زبردست قوت سے دنیا آگاہ ہو جائے گی اور ایک کرہ سے دوسرے تک سلسلۂ پیام رسانی جاری ہو جائے گا۔

جس دن نسیم کرۂ مریخ پر اپنے فرائض انجام دیکر واپس آیا تو معلم اکبر نے ہم سب کو طلب کیا تاکہ نسیم اپنی رپورٹ سنائے۔ نسیم نے بیان کیا کہ جب وہ معلم اکبر کی ہدایت کے موافق کرۂ مریخ پہونچا تو وہاں کی حق پرست جماعت بہت سقیم حالت میں تھی اور ظلماتی افواج نے سخت فساد برپا کر رکھا تھا لیکن اس نے پہونچکر ایک سیاہ ابر کے اندر ان افواج کو گھیر لیا اور آخر کار وہ بالکل منتشر ہو گئی اور جماعت حقہ غالب ہو کر امن و سکون کی اشاعت میں مصروف ہو گئی

صرصر یہ سنکر فرط مسرت سے اچھل پڑا اور معلم اکبر سے عرض کی کہ "اے آقا مجھے بھی کچھ قوت و روشنی عطا کر تاکہ میں بھی وہاں پہونچکر فطرت کا پیام لوگوں کو پہونچاؤں"

معلم اکبر یہ سنکر مسکرایا اور ساتھ ہی دوست پرست سے خطاب کیا کہ وہ اپنا نظریہ بیان کرے۔ دوست پرست نے کہا "اس وقت بہت کم ایسے ذہین و دانشمند نفوس پائے جاتے ہیں جو تمام مذاہب عالم میں اتحاد پیدا کرنے اور مختلف اقوام کا اختلاف دور کر کے امن و سکون پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ لیکن وہ وقت جلد آنے والا ہے جب ایسے ہی وسیع النظر، ترقی پسند لوگ بکثرت پیدا ہوں گے اور انھیں تدابیر پر غور کریں گے جو اسوقت اس کرۂ محبت میں ہم سب کے سامنے ہے۔

جامِ زر اور دلآرام کے خیالات یقیناً قابل مبارکباد ہیں، لیکن میں نے جو کچھ سوچا ہے وہ یکسر عملی چیز ہے۔ میرا مدعا یہ ہے کہ کائنات کے تمام کروں میں جہاں آبادی پائی جاتی ہے۔ باہمد گر روابط گفت و شنید قایم کئے جائیں اور اس طرح

ان سب کو ایک نظام اور ایک ہی رشتہ سے وابستہ کر دیا جائے ۔ ایک کائناتی حکومتِ وفاق۔ ایک عالمگیر جمہوریت ایک کائنۂ سیارگان عالم ۔۔۔"

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ صرف خیال ہی خیال نہیں ہے۔ کیا عملاً اس کا حصول اتنا دیر طلب و مستبعد نہیں ہے کہ فی الحال اس پر گفتگو کرنا قبل از وقت سمجھا جائے۔"

دوست پرست نے شفقت آمیز نگاہ سے دیکھتے ہوئے جواب دیا کہ "اے کرۂ ارض کے فرزند، یہ دن تو لوحِ محفوظ میں مقرر ہو چکا ہے، معلم اکبر فیصلہ کر چکا ہے کہ یہ ہو کر رہے گا اور اسوقت ہم اسی کا سنگ بنیاد رکھنے جا رہے ہیں"

جامِ زر بولا۔ "اے دوست پرست، ان رازوں کے انکشاف میں اتنی جلدی نہ کرو، ممکن ہے ہمارے درمیان بعض ایسے نفوس بھی ہوں جن کو پہلے اس سے زیادہ نرم غذا دینے کی ضرورت ہو۔"

دوست پرست نے کہا "اس راز کو چھپانے کی ضرورت نہیں جبکہ ہم اس کو بے نقاب کرنے ہی کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں اور یہاں کوئی متنفس ایسا نہیں ہے جو اس راز کو برداشت نہ کر سکے۔"

میں نے حیرت سے معلم اکبر کی طرف دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا "دوست پرست نے جو کچھ کہا وہ بالکل صحیح ہے۔ اس وقت تمام سیارگانِ عالم کے باشندے آہستہ آہستہ لیکن نہایت استحکام کے ساتھ بلندی کی طرف جا رہے ہیں۔ یاد رکھو کہ دنیا میں حقیقت ہمیشہ ایک ہی رہی ہے اور ہر زمانہ اپنے استعداد کے لحاظ سے اسکو قبول کرتا ہے۔

اس وقت جامِ زر، دلآرام اور دوست پرست نے جس حقیقت کا اظہار کیا ہے، اسی پر کائنات کا مستقبل قایم ہونا ہے، اور فی الحال تم سب کو اپنا مقصود سیارۂ امن و سکون تک پہونچنا قرار دینا چاہئے۔"

حر حر نے پوچھا "یہ سیارہ کہاں ہے"

معلم اکبر نے کہا "یہ ہر شخص کے دل کے اندر موجود ہے"

میں نے پوچھا "کرۂ زمین پر حصولِ امن اور دفعِ جنگ کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئے"

معلم اکبر نے جواب دیا کہ "امن و سکون پھیلانا سب سے پہلے ماؤں کا فرض ہے، اس کے بعد اُستادوں کا، ماں کی گود میں جو بات ان کی کان میں پڑے وہ امن و سکون کی ہو اور مدرسہ میں جو سبق ان کو دیا جائے وہ صلح و آشتی کا ہو۔ اسی کے ساتھ عمال حکومت کو امن پسندانہ قانون کا نفاذ کرنا چاہئے اور اخباروں میں اسکی تلقین برابر ہوتی رہنا چاہئے، جاؤ ایک جامعہ صرف امن و سکون کی تعلیم کی غرض سے قایم کرو۔ ایک متحدہ انجمن بھی بناؤ جسمیں ہر قوم و مسلک کے مرد و عورت شریک ہوں اور ان کا مقصود صرف اشاعتِ امن ہو۔ فوجوں کو توڑ دو کیونکہ وہ خوف و بے اطمینانی پیدا کرتی ہیں، ایک ایسا ترانہ پیش کرو جسے ہر قوم کے بچے یکساں جوش سے گائیں، ایک ایسا جھنڈا بناؤ جس کے نیچے کرۂ زمین کے تمام باشندے جمع ہو سکیں، ایک بین الاقوامی معیارِ اخلاق و تہذیب کا ایسا قایم کرو جسپر

سب یکساں کاربند ہوں، الغرض ہر اس چیز کو فنا کردو جو ہلاکت یا بربادی پیدا کرنے والی ہے اور ایسی فضا پیدا کردو جس میں سوائے محبت و ہمدردی کے کچھ نہ ہو"

حاکم حاکمیان نے جو سیارۂ ارانوس سے آیا تھا پوچھا کہ " یہ تمام باتیں کتنے زمانہ میں قابل عمل ہوں گی"

معلم اکبر نے جواب دیا " بہت تھوڑے زمانہ میں، کیونکہ لوگوں کے دلوں میں اس خواہش کا تخم بویا جا چکا ہے"

میں نے پوچھا کہ " میں اپنے بزرگوں کو کیا پیغام جا کر سناؤں؟"

معلم اکبر نے جواب دیا " میں نے جو کچھ تم سے کہا وہی پیغام تمام کرۂ ارض والوں کے لئے ہے۔ جب تم ان کے پاس جاؤ تو ان سے کہو کہ " اے انسانیت کے رہنماؤ، اے کرۂ ارض کے دانشمندو، اے زمین کے حاکمو، وہ روشنی جس کا دنیا کو انتظار تھا تمہارے قدموں کے پاس ہے، آنکھیں کھول کر دیکھو اور اسی کی مدد سے اپنی راہِ عمل تلاش کرو، تم اب ایک نئے دور میں قدم رکھ رہے ہو، ایک نئی روح تمہاری منتظر ہے، لڑائیاں بند کردو، باہمی اختلافات مٹا دو، اور جب تم کسی پر ظلم کرو تو سمجھو کہ یہ تمہارے ہی گوشت و خون کا ایک جزو ہے، صورت و شکل کا فرق کوئی چیز نہیں، نسل و قوم کا امتیاز کوئی معنے نہیں رکھتا اور خدا نے سب کو ایک ہی طرح کی زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ وہ زندگی جو سراسر عمل ہے لیکن عملِ محبت۔ وہ زندگی جو یکسر لطف و ہمدردی ہے اور جو صرف دوسروں کے دلوں کے اندر رہ کر بسر کی جاتی ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں جنھیں نئی نسل کو زیادہ سمجھنا چاہئے، کیونکہ قوم کے تجربہ کار بوڑھے نوجوانوں ہی کو آئندہ جنگ کے لئے طیار کر رہے ہیں اور انھیں کا خون اپنے جذبۂ خود غرضی پر بہانا چاہتے ہیں۔ یہی نوجوان مرنے مارنے کے لئے آگے کئے جائیں گے اور انھیں کی بیویاں اور مائیں ان کی واپسی کے انتظار میں تڑپ رہی ہوں گی"

یہ سنکر میری حالت متغیر ہو گئی اور میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ شاید میرا دل سینہ سے باہر آجائیگا۔ خون نہایت تیزی سے رگوں میں دوڑ رہا تھا اور ضربات نبض کا یہ عالم تھا گویا ان کا درمیانی وقفہ مٹ گیا اور انکی جنبش کا نظام کسی برقی رو سے متعلق ہو گیا ہے۔ میں علحدہ ایک گوشہ میں جا کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور دیر تک اپنی قوم کی حالت پر آنسو بہاتا رہا۔

باب (۸)

حاکم حاکمیان

جب اول اول ہم معلم اکبر کے حضور میں حاضر ہوئے تھے تو میں نے اپنے پاس ایک عجیب و غریب روشن ہستی کو پایا جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہی حاکم حاکمیان ہے جو سیارۂ زحل سے آیا ہے۔

مکتبہ نگار عربی حسینہ

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ بحث کیگئی ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے قیمت تین روپیہ (۳ر) علاوہ محصول خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مجموعۂ استفسار و جواب ۳ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۲۲ء سے لیکر ۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔ قیمت فیجلد تین روپیہ (۳ر) علاوہ محصول خریداران نگار سے فی جلد ایکروپیہ کم

جذبات بجماشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲ر)
خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔
۲- مادئین کا مذہب۔
۳- حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ر)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے دو آنہ (۲ر) کم

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ر)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲ر)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شایستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (۲ر)
علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

کمال حرارت

نوجوانی کمال — جوانمردی کمال — وصل کمال — اُمنگ کمال

KAMAL کمال

رجسٹرڈ REGD.

خون کی افزائش کے لئے دُنیا کی بہترین دَوا ہے۔ رگ و ریشہ میں خون پہنچا کر جوش اور اُمنگ پیدا کرتی۔

اعصاب کو تقویت دے کر اعضاء کو قوی اور مضبوط بناتی،

دل و دماغ کو قوت دیتی، کسل و ماندگی، سُستی و کاہلی کو دفع کر کے چُستی و چالاکی پیدا کرتی ہے،

غرض کہ جو قوت ایک مرد کو صحیح معنی میں مرد کہلا سکتی ہے

"وہ کمال" ہی کی رہین منت ہے

نشے والی اور زہریلی چیزوں سے پاک ہے

قیمت فی شیشی آٹھ روپے

مزید معلومات کیلئے فہرست طلب کیجئے!

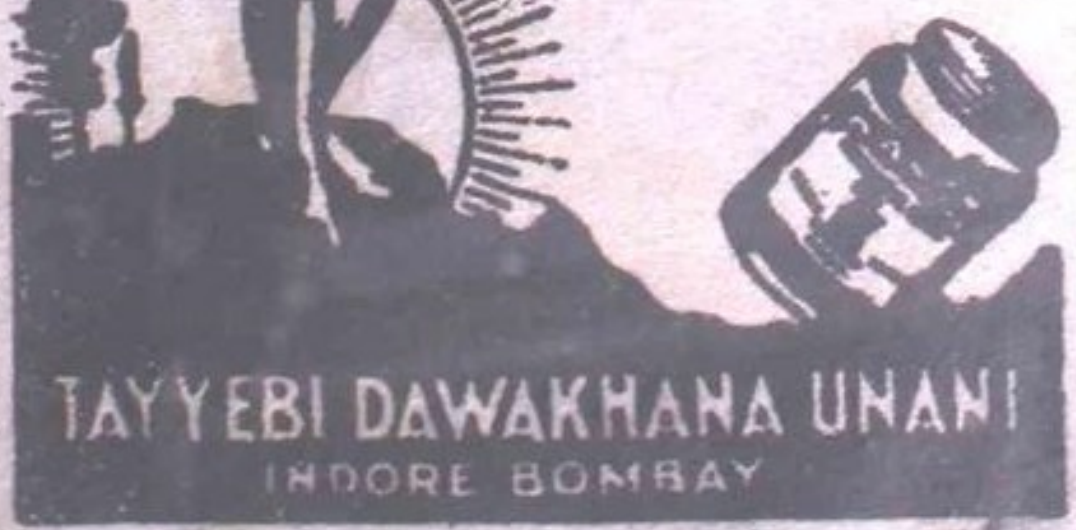

طیبی دَواخانہ یونانی

گنج بازار، اندور	۹۶، محمد علی روڈ بمبئی ۳
تار کا پتہ "شاہی" اندور	ٹیلیفون نمبر ۳۶۹۸۳

پبلشر: فضل حسین، انوار پریس، اندور، مدیر: ابوالوفا